خطوطِ رشید احمد صدّیقی

(جلد ہشتم)

مرتبین

م۔ ندیم شمسی (علیگ)

لطیف الزّماں خاں

Scanned with CamScanner

خطوطِ رشید احمد صدّیقی

(جلد ہشتم)

مرتبین

مہر الٰہی ندیم شمسی (علیگ)

لطیف الزماں خاں

دانیال

ضابطہ

ناشر : حوری نورانی

مکتبۂ دانیال، سنو وہائٹ موبائل سینٹر

عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

MACBURN AGENCIES (Pvt) Ltd.
Hakimsons Building, 19 West Wharf Road,
Karachi-74000
Phone: 32201864, 32201537
Fax: (92-21) 32310469
Email: macburn@cyber.ent.pk

اہتمام : ڈاکٹر مہ جبیں، ڈاکٹر انیس الزماں خاں

لالہ رُخ، تنویر الزماں خاں

پہلا ایڈیشن : اپریل ۲۰۱۰ء

طابع : ذکی سنز پرنٹرز۔ کراچی

قیمت : ۲۰۰ روپے

انتساب

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی صاحب

اور

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب

کے

نام

عرضِ ناشر

لطیف الزماں خان اور مہر الٰہی ندیم کے مرتب کردہ سلسلہ خطوطِ رشید احمد صدیقی کی جلد ہشتم تاخیر کے بعد شائع ہو رہا ہے جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

خطوط کی تعداد کم تھی بہ نسبت پچھلے نمبروں۔ لہٰذا اُس کی ضخامت اور افادیت کی غرض سے آل احمد سرور کے مرتب کردہ ''رشید احمد صدیقی'' کے خطوط کا پیش لفظ اور رشید احمد صدیقی کا نیاز فتحپوری کے ''مجموعہ نیاز پر اظہار خیال'' شامل اشاعت ہے۔

نیز شورش کاشمیری کا منظوم شاہکار ''رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش پر اک نظر'' بھی شامل ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کی تہذیبی تاریخ کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس دریا کو اک کوزہ میں اس طرح تین لفظوں میں سمویا ہے

''اردو، غالب اور تاج محل''

فہرست

خطوط بنام	تعدادِ خطوط	صفحہ نمبر

رشید احمد صدیقی کی یاد میں

(رشید احمد صدیقی کی صد سالہ بین الاقوامی تقاریب منعقد علی گڑھ میں یکم نومبر کو پڑھا گیا
ایک تاثراتی مضمون)

پچھلے دنوں پروفیسر نعیم احمد، صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا خط آیا کہ میں رشید احمد صدیقی کی یاد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی صد سالہ تقاریب میں شرکت کروں اور علی گڑھ والوں کے ساتھ مل کر انہیں حسب توفیق یاد کروں۔ میں نے انہیں لکھا کہ جب اتنے سارے لوگ مل کر رشید صاحب کو یاد کر رہے ہوں تو وہاں میرا کیا کام۔ میری عین خواہش تو یہ ہے کہ میں ان تقاریب میں شرکت کروں جو آج سے سو سال بعد ان کے دو سو سالہ جنم دن کے موقع پر منعقد کی جائیں گی۔ جواب آیا "مانا کہ آپ مثالی صحت رکھتے ہیں لیکن مثالی صحت اور خیالی صحت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کارِ خیر کے لیے آپ مزید سو سال تک کہاں انتظار کریں گے۔ ابھی آجایئے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ میں رشید صاحب کو کسی مقررہ وقت پر یاد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ وہ تو مجھے ہر دم، متواتر اور لگاتار یاد آتے رہتے ہیں۔ جو آدمی اردو میں

مزاح نگاری کرے گا وہ رشید صاحب کو یاد نہیں کرے گا تو پھر کسے یاد کرے گا۔ رشید صاحب کے تعلق سے علی گڑھ والوں کی یاد میں اور میری یاد میں فرق صرف اتنا ہے کہ علی گڑھ والوں کو شاید پہلے رشید صاحب یاد آتے ہوں اور پھر علی گڑھ یاد آتا ہو اور تب کہیں جا کر ان کے شہرۂ آفاق فقرے اور جملے یاد آتے ہوں۔ مگر میرا معاملہ الٹا ہے۔ مجھے پہلے ان کے خیال انگیز فقرے اور چونکا دینے والے جملے یاد آتے ہیں اور پھر بعد میں خود رشید صاحب اور علی گڑھ کا خیال آتا ہے۔ علی گڑھ والوں کی یاد میں رشید صاحب کا وہ جسمانی وجود بھی شامل رہتا ہوگا جو کبھی سرگرم عمل اور متحرک تھا۔ مگر رشید صاحب کے تعلق سے میری یادوں کا معاملہ صرف خیال اور تصور پر مبنی ہے۔ اس یاد کو میں بھلے ہی کوئی شکل نہ عطا کرسکوں، کوئی نام نہ دے سکوں لیکن یوں لگتا ہے جیسے یہ یاد میرے اپنے مزاج کا، میرے اپنے شعور کا بلکہ میرے اپنے سارے وجود کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رشید صاحب کے تعلق سے میری یاد کا سلسلہ ان کے فنکارانہ وجود سے ہے۔ ان کے شخصی اور جسمانی وجود سے نہیں۔ میں یہ یاد کرنے کا محتاج نہیں کہ میں رشید صاحب سے کب، کہاں اور کن حالات میں ملا تھا۔ البتہ مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ رشید صاحب کا پہلا مضمون میں نے کب، کہاں اور کن حالات میں پڑھا تھا اور اسے پڑھنے کے بعد مجھ پر کیا بیتی تھی۔ شاید میں وہ نہیں رہا تھا جو مضمون کو پڑھنے سے پہلے تھا۔ مجھ میں ایک شخصی کمزوری یہ ہے کہ میں جس کسی کا حد درجہ پرستار ہوجاتا ہوں تو اس ہستی کے اور اپنے درمیان احترام اور عقیدت کا ایک لمبا فاصلہ قائم کرلیتا ہوں، اس سے نہ ملنے کے لیے ہی نہیں بلکہ اس ہستی سے دور رہنے کے سو سو جتن کرتا ہوں۔ احترام کا جذبہ غالباً وہ واحد جذبہ ہے جس کا تعلق بس محسوس کرکے اور محسوس کرنے پھر سے محسوس کرنے سے ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتوں کو آدمی کاغذ پر نہیں اتارتا کیونکہ ایسی شخصیتوں کو قرینے سے سجا کر رکھنے کے لیے دل کے ایک گوشہ میں ایک الگ جگہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ رشید صاحب کی زندگی کے آخری چار پانچ برسوں میں کئی بار علی گڑھ جانے کے باوجود میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ان کا دیدار نہیں کیا۔ ایک بار ایک دوست کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دوست نے بتایا ''پروفیسر رشید احمد صدیقی یہاں رہتے ہیں۔'' اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا ''رشید صاحب جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔'' اس پر میرے دوست نے کہا تھا ''عجیب آدمی ہو تم بھی۔ علی گڑھ آئے ہو تو ان سے مل کیوں نہیں لیتے؟'' میں نے کہا ''بھیا! رشید صاحب ان دو ایک قابلِ احترام ہستیوں میں سے ہیں جن کے بت ہم نے اپنے ذہنوں میں بٹھا رکھے ہیں۔ اب ان بتوں کو گوشت اور پوست کے انسان کے روپ میں دیکھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ ہمارے ذہنوں اور احساس میں بالکل ٹھیک جگہ کھڑے ہیں۔ انہیں وہیں کھڑا رہنے دو۔'' اس کے بعد میں نے عقیدتاً رشید صاحب کے گھر پر نظر ڈالی۔ میری نظر اچانک چند پودوں پر پڑ گئی۔ یاد آیا کہ رشید صاحب کو باغبانی سے بھی شغف رہا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب احساس مجھ میں یہ پیدا ہوا جیسے میں کوئی فرد نہیں بلکہ رشید صاحب کے باغ میں لگا ہوا ایک پودا ہوں۔ احساس کی اس لطافت نے کتنی ہی دیر تک مجھے سرشار رکھا۔ رشید صاحب کے تعلق سے بس ایسی ہی یادیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

یادش بخیر! 1952ء میں ایک نصابی کتاب میں رشید صاحب کا مضمون ''ارہر کا کھیت'' پہلی بار پڑھا تھا۔ اس کے بعد رشید صاحب کی تحریریں جہاں اور جیسے بھی ملیں انہیں وہیں اور اسی حالت میں پڑھا۔ ان کے بے شمار فقرے یوں یاد ہو گئے تھے (اور آج بھی یاد ہیں) جیسے یہ نثر کے فقرے نہ ہوں غالب اور میر کے شعر ہوں۔ لوگ کسی مزاح نگار کے بیان کیے ہوئے مزاحیہ واقعات اور لطیفے تو یاد رکھ لیتے ہیں لیکن کسی مزاح نگار کے لکھے ہوئے فقروں کا ذہن میں محفوظ ہو جانا اور ان سے لطف و انبساط کا ہر بار

ایک نیا عالم خلق ہوجانا یہ رشید صاحب کا ہی حصہ ہے۔ رشید صاحب کی تحریریں پڑھتے ہوئے چالیس پینتالیس برس بیت گئے۔ انہیں ہر عالم، ہر موسم اور ہر دور میں پڑھا اور ہر بار کیف و سرور کے ایک نئے ذائقہ سے روشناس ہوا۔ نوجوانی میں ان کے فقروں کا مطلب کچھ اور سمجھ میں آتا تھا۔ اب اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ وفات سے قریب ہوتا جا رہا ہوں تو ان کا مطلب کچھ اور سمجھ میں آتا ہے۔ رشید صاحب ایک وقت میں پڑھنے کی چیز نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ ان کی کتابیں پڑھی ہیں لیکن ہر بار انہیں پڑھتے ہوئے کوئی نہ کوئی نیا گوشہ ضرور سامنے آجاتا ہے۔ ذہن کی کھڑکیاں کیسے کھلتی ہیں اور ذہن میں کوندا کس طرح لپک جاتا ہے اس کا اندازہ رشید صاحب کے مضامین پڑھنے سے ہی ہوا ورنہ ہمیں تو پتہ بھی نہ تھا کہ ہمارے ذہن میں بھی کھڑکیاں ہیں اور یہ کہ یہ کھل بھی سکتی ہیں۔

رشید صاحب نے علی گڑھ کی نظر سے دنیا کو دیکھا بلکہ علی گڑھ ہی کو کل کائنات سمجھا۔ ہم جیسوں نے دنیا کی نظر سے رشید صاحب اور علی گڑھ دونوں کو دیکھا۔ رشید صاحب تو سمجھ میں آگئے لیکن علی گڑھ آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ میں کئی بار علی گڑھ آتا ہوں اور ہر بار حیران ہوکر یہاں سے جاتا ہوں کہ آخر کس طرح رشید صاحب نے اس چھوٹے سے قصبہ کو اپنے اندر اس طرح آباد کرلیا تھا کہ یہ سمٹ جائے تو دل عاشق بن جائے اور پھیلے تو زمانہ۔ مگر اس میں بھی خوبی رشید صاحب کی نظر آتی ہے۔ ایک بار برسات کے موسم میں یہاں آنا ہوا۔ شہریار میرے ساتھ تھے۔ سڑک پر چلنے لگا تو ایک مرحلہ پر مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا لہٰذا رُک گیا۔

پوچھا ''کیا رشید صاحب علی گڑھ کی ان ہی گلیوں پر نثار تھے؟''

بولے ''رشید صاحب کا علی گڑھ یہ نہیں ہے۔''

علی گڑھ سے گزرتے ہوئے تالوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک نے میری

آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ شہریار سے پوچھا ''اس دھول کا رشید صاحب کے علی گڑھ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟'' بولے ''رشید صاحب کا علی گڑھ تو آپ کو یونیورسٹی کیمپس کے اندر ملے گا۔'' تھوڑی ہی دیر بعد یونیورسٹی کیمپس میں ایک پروفیسر سے ملاقات ہوگئی جنھوں نے اپنی عالمانہ باتوں کے ذریعے میری جہالت میں خاصا اضافہ فرمایا۔ پوچھا ''کیا یہ بھی رشید صاحب کے علی گڑھ کا حصہ ہیں؟''

شہریار نے بے بس ہو کر مجھے رشید صاحب کے ہی ایک فقرے سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ''مسخرے کو معلم بنانا ستم ظریفی ہے لیکن معلم کا مسخرہ بھی رہ جانا بدتوفیقی ہے۔'' پھر بولے ''کسی کی بدتوفیقی کی ذمہ داری رشید صاحب پر کس طرح عائد ہوسکتی ہے۔''

میں نے کہا ''پھر مجھے رشید صاحب کے علی گڑھ کو دیکھنے کی توفیق کب عطا ہوگی؟''

تنگ آ کر بولے ''بھیا! یہ کیا آپ علی گڑھ کے پیچھے پڑے ہیں۔ آخری دنوں میں رشید صاحب کے علی گڑھ کے حدود اربعہ ان کے گھر کے حدود اربعہ میں سمٹ آئے تھے۔ اس لیے تو زندگی کے آخری دنوں میں اپنے علی گڑھ میں رہنے کی غرض سے وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔''

سچ پوچھیے تو رشید صاحب کا علی گڑھ عمارتوں، سڑکوں اور گلیوں سے عبارت نہیں تھا بلکہ ان آدمیوں سے عبارت تھا جو کبھی ان عمارتوں میں آباد تھے اور یہاں کی سڑکوں پر چلتے پھرتے تھے۔ شہر سڑکوں اور عمارتوں سے نہیں بنتا۔ ان افراد سے بنتا ہے جو اس شہر میں آباد ہوتے ہیں۔ یوں بھی رشید صاحب کا علی گڑھ تو ایک زاویہ نگاہ تھا، ایک طرزِ زندگی تھا۔ ایک انداز نظر تھا، جینے کے ایک نئے ڈھنگ کا عنوان تھا۔ رشید صاحب کے علی گڑھ کو سڑکوں اور عمارتوں تک محدود کرنا بدتوفیقی ہے۔ ان کا علی گڑھ تو فکر و نظر کی نئی راہوں سے عبارت تھا۔ علم و دانش کے کھلے ہوئے نئے نئے ایوانوں سے تھا۔ اس

علی گڑھ میں علی گڑھ بھی تھا اور ساری کائنات بھی تھی۔ یہ قصبہ بھی تھا اور براعظم بھی۔ رشید صاحب کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کا علی گڑھ بدل رہا ہے۔ آج سے سینتیس (37) سال پہلے لکھے ہوئے ایک مضمون میں انہوں نے کہا تھا 'میرا علی گڑھ سرسید کے عہد سے قریب تھا اور آپ کا علی گڑھ سرسید کے عہد سے بہت دور آ گیا ہے۔''

رشید صاحب زندگی بھر تین باتوں کے لیے پریشان رہے۔ اردو، علی گڑھ اور مسلمان۔ اردو اور علی گڑھ کے بارے میں مجھ سے بہتر لوگ کچھ کہیں گے۔ میں یہاں مسلمانوں کے بارے میں خود رشید صاحب کی ایک تحریر کو نقل کر کے اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا۔ رشید صاحب نے یہ تحریر لگ بھگ پچاس برس پہلے لکھی تھی۔

''ہندوستانی مسلمانوں میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے تھے جتنے جانماز کے۔ وہ بیماری کو علاج، صبر و پرہیز سے دور کرنے کے بجائے اس کو پروپیگنڈہ بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے تھے۔ وہ جنگ کے لیے کیل کانٹے سے تیار ہونے کے بجائے دشمن کو اکسانے پر زیادہ قائل تھے۔ اس سے بڑھ کر ناعاقبت اندیشی اور کیا ہو سکتی ہے۔''

غور فرمایئے کہ رشید صاحب کا یہ بیان ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ زندگی پر بھی کتنا صادق آتا ہے اور کیا عجب کہ آئندہ بھی صادق آتا رہے۔

معاف کیجیے۔ میں شاید زیادہ ہی سنجیدہ باتیں کرنے لگ گیا۔ میرا منصب بھی نہیں ہے۔ مسخرے کا معلم بن جانا تو ستم ظریفی ہے ہی لیکن ایک مسخرہ عالمانہ باتیں کرنے لگ جائے یہ بھی کم کچھ ستم ظریفی نہیں ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات کو مختصر کرنا چاہوں گا۔ حضرات! وہ ہستی جس نے اردو ادب کو ایک نیا اسلوب اور ایک نیا آہنگ عطا کیا تھا، سو برس پہلے ہمارے درمیان پیدا ہوئی تھی اور میری تمنا یہ ہے کہ آج سے سو سال بعد بھی اردو ادب کے اس محسن کو اسی طرح یاد کیا جائے جس طرح آج ہم انہیں یاد کر رہے ہیں۔ کم از کم

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے آنے والے برسوں پر محیط کوئی لمبی چوڑی بات کہتے ہوئے نہ جانے کیوں زبان لڑکھڑا سی جاتی ہے۔ آج کی حد تک اگر ہم رشید صاحب کو یاد کرنے کے بہانے اس علی گڑھ کی بازیافت کر سکیں جو رشید صاحب کے مضامین میں نظر آتا ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ رشید صاحب کو یاد کرنا ضائع نہیں گیا۔ میں اردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز اور اردو مزاح نگار کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

مجتبیٰ حسین

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اسلوب نگارش پر ایک نظر

شورش کاشمیری

رنگینیٔ چمن میں فضا ہے ڈھلی ہوئی — شیرینیٔ سخن میں حیا ہے ڈھلی ہوئی

الفاظ کے نگر میں مطالب کی چاندنی — فقروں میں کہکشاں کی ضیاء ہے ڈھلی ہوئی

اوجِ کمال پر ہے علی گڑھ کا زمزمہ — اور زمزمہ کی لے میں وفا ہے ڈھلی ہوئی

انشاء کے دغدغے میں فصاحت رچی بسی — خوشبو کے پیرہن میں صبا ہے ڈھلی ہوئی

غالب کی فکر، میر کا لہجہ، جگر کی لے — اس سے بھی کوئی چیز سوا ہے ڈھلی ہوئی

اقبال کے کلام مرصّع کا ارتباط — اکبر سے نغز گو کی نوا ہے ڈھلی ہوئی

معراج پر مغنیٔ آتش نفس کی لے — تاب و تبِ فسانہ سرا ہے ڈھلی ہوئی

زورِ بیاں میں سحر نگارش غزل سرا — حسنِ زباں میں تیغ وغا ہے ڈھلی ہوئی

المختصر وہ سحر بہ قولِ ابوالکلام — آہنگِ نے میں آہِ رسا ہے ڈھلی ہوئی

دہلی کے رکھ رکھاؤ کا نقشہ کھنچا ہوا — لاہور و لکھنؤ کی صدا ہے ڈھلی ہوئی

معنی و لفظ بہر تماشا تلے ہوئے
یا باب ملتزم پہ دعا ہے ڈھلی ہوئی

کچھ ان خطوط کے بارے میں

"ایک ہجوم جمع ہوگا اور کسے معلوم نہ ہوگا کہ وہ اسی سڑک پر چل رہا ہے جہاں وہ ہستی کبھی خراماں ایک آتشیں ابر معلوم ہوتی تھی۔" (ڈبلو۔ بی۔ ییٹس)

رشید صاحب کی اہمیت اور معنویت کے کئی پہلو ہیں مگر اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ ان کی شہرت و عظمت کا دار و مدار زیادہ تر ان کے طنز و مزاح کے سرمائے پر ہے۔ یہ رنگ یوں تو ان کی سبھی تصانیف میں جھلکتا ہے مگر خصوصیت سے مضامینِ رشید، خنداں اور خطوط میں جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ کے مرقعوں، خود نوشت آشفتہ بیانی میری اور طنزیات و مضحکات میں بھی جو آب و تاب ہے وہ اس مخصوص جوہر کی کار فرمائی کی وجہ سے بھی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا ہے کہ:

"جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی کا درجہ متعین ہوتا ہے۔"

وہ طنز و ظرافت کو آسانی سے ہاتھ آجانے والے لیکن پُر پیچ اور خطرناک آلے، سمجھتے ہیں۔ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے پتے کی بات یہ کہی ہے کہ طنز کی محرک برہمی یا بیزاری ہوتی ہے، ظرافت کی تفریح و تفنن۔ ان کا رشتہ نفسِ واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِ عمل سے بھی۔ تخفیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔ یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ:

"ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ظرافت کے لیے خوش دلی اور رحمت درکار ہوتی ہے۔ طنز میں

جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔"

انھوں نے یہ تو درست کہا ہے کہ ظرافت طنز سے مشکل فن ہے اور میرے نزدیک اسی وجہ سے اعلیٰ تر۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے میرے نزدیک محلِ نظر ہے۔ طنز رواداری، قابلِ قبول، ادبی، دقیع، گراں مایہ اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس میں ظرافت کی ایک لہر جاری و ساری رہتی ہے۔ احتشام حسین نے صحیح کہا ہے کہ طنز کا وجود مزاج کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہاں! مزاح طنز سے بالکل پاک بھی ہو سکتا ہے۔ مزاح زندگی کے نشیب و فراز سے لطف لینے کا نام ہے۔ طنز اس نشیب و فراز کو ہموار کرنے میں معروف رہتی ہے۔ مزاح نگار زندگی کا تماشائی ہے۔ طنز نگار زندگی کو ہموار کرنے کی سعی میں معروف۔ مزاح نگار ہر دیوتا کے مٹی کے پاؤں اور ہر دیو کے اندر بونا دیکھتا ہے۔ اور اس تضاد سے لطف لیتا ہے۔ طنز نگار دیو کو بونا ثابت کرنے پر مصر ہوتا ہے۔ ظرافت میں نکتہ سنجی یا WIT لفظ کے امکانات سے کھیلنا اور وہ تخیل جو ہر جبت کو سی لاحاصل یا ہر تعلی کو کھوکھلا یا ہر تند جینی کو احساس برتری (در پردہ احساسِ کمتری) ثابت کردے، دونوں شامل ہیں۔ ہاں WIT میں لفظ کے خاص استعمال پر زور ہے اور ہیومر (مزاح) میں خیال کی چاندنی پر۔ کمبل کو حاجی صاحب نے کراگا سے اٹھا کر سائبین پر ڈال دیا WIT کا نمونہ ہے اور جوانی میں آدمی باغ نہیں لگاتا، باغ میں گناہ کرتا ہے۔ بڑھاپے میں باغ کی ہوا کھاتا ہے اور توبہ و استغفار کرتا ہے، مزاح کا۔ میرے سفر کی محرک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں آپریشن کرانا یا سفر خرچ وصول کرنا، جن کے مجموعے کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے مزاح کا نمونہ ہے اور میں اس سیٹ کے گوشے میں پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا کہ کہیں اسباب کے ساتھ اس خاکسار اسباب بغاوتِ ہند کو بھی حراست میں نہ لے لیں، صنعت لفظی یا WIT کا۔ میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں طنز کا اچھا نمونہ ہے۔ میں نے بحر بھی متعین نہیں کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کردی وہ مزاح ہے جس میں لطیف طنز شامل ہے۔ بخاری بڑے بت شکن تھے جہاں خداؤں میں وہ صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے۔ یہاں طنز نظر آتی ہے مگر دراصل مزاح کی کارفرمائی ہے اس لیے کہ اعتراض مقصود نہیں۔ بخاری کی شخصیت کی طرحداری کی طرف اشارہ ہے۔

رشید صاحب نے اشعار سے اپنے مزاج میں بڑا کام لیا ہے۔۔۔ بارش اور سنایہ تعمیر سے مکان کا کیا یہ رنگ کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار۔ شیطان سے الجھنے کے بعد شاعر نے زمین پر آکر یہ مصرع موزوں کیا ؎

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

چونکہ رشید صاحب کے یہاں وہ تخیل، وہ اجتماع الضدین کی صلاحیت اور زبان پر وہ قدرت فیاض فطرت نے ودیعت کی تھی جسے حس ظرافت کہتے ہیں اس لئے ان کے مضامین کے علاوہ ان کے خاکوں، ان کے خطبوں اور ان کے خطوط سب میں اس کی لہر ملتی ہے۔ ان کی شناخت، ان کی انفرادیت، ان کی کشش اس میں اپنی بہار دکھاتی ہے۔

پہلے طنز کو اصلاح کا آلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب نقاد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طنز اصلاح سے زیادہ ایک تزکیہ کے ذریعے سے ادب بنتی ہے۔ کچھ لوگ طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا سلیقیت کی دلیل ہے۔ جس طرح رومانیت تخیل کا ایک مسلک ہے اسی طرح طنز اس کا دوسرا مسلک۔ دونوں کی اہمیت ان کے ادبی حسن کی وجہ سے پرکھنی چاہیئے۔ اچھی طنز، اچھے وار کی مانند ہے، یعنی کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے۔

یوں تو اردو میں طنز و ظرافت کا سرمایہ شاعری میں بھی خاصا رو دار ہے۔ سوداؔ، نظیرؔ، اکبرؔ غالبؔ ظریف کے ہوتے ہم اسے کس طرح نظر انداز کرسکتے ہیں۔ مگر یہی بات یہ ہے کہ اس میں جو بلندی، پہلوداری، تہہ داری اور کاٹ نثر میں آئی ہے وہ کچھ زیادہ ہی وقیع کہی جاسکتی ہے۔ نثر میں ظرافت کے لازوال نمونے غالبؔ کے خطوط میں ملتے ہیں۔ اودھ پنچ کی نثر کی تاریخی اہمیت زیادہ ہے۔ ادبی اہمیت کم۔ مگر سرشارؔ کے فسانۂ آزاد کے کچھ حصے، نذیر احمد کی نثر، محفوظ علی بدایونی کے مطائبات، مضامین فلک پیما، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالکؔ، چراغ حسن حسرتؔ، قاضی عبدالغفار، عابد حسین، اور حال میں مشتاق احمد یوسفی اور خامہ بگوش کے کارناموں کی وجہ سے اردو میں طنز و ظرافت کی بساط شوخیٔ فکر اور رعنائی فن کی ایسی جنت ہوگئی ہے جس کا حسن سدا بہار ہے۔

رشید صاحب کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو اکبر کے بڑھاپے کے خطوط کی طرح امراض کی روداد ہیں یا کتابوں کی رسید۔ مگر ایسے خطوط کی تعداد بھی بہت ہے جن میں انھوں نے

بے تکلفی سے زندگی، ادب، ماحول، مشاہیر، موت اور اپنے معاصرین کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے خطوط کے پانچ مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ اب ایک اور مجموعہ دو سو گیارہ خطوط کا جو میرے نام لکھے گئے تھے منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ خطوط رشید صاحب کی شخصیت کا آئینہ بھی ہیں اور ان کے قوس قزح کی طرح رنگا رنگ اور طرح دار مزاحیہ اسلوب کے بہترین نمائندے بھی۔

رشید صاحب کے ان خطوں سے متعلق کچھ کہنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری کے آداب کے سلسلے میں رشید صاحب نے خود جو کچھ لکھا ہے اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے:

"بے تکلف اور مخلص دوستوں کو خط لکھنے میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ ان خطوں میں مجھے سب کچھ کہہ دینے میں مطلق باک نہ ہوتا۔ یہ میرے اچھے برے خیالات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے اس کا خیال آیا کرتا تھا کہ کہیں یہ منظر عام پر نہ آجائیں۔ چنانچہ ایک بار ایک عزیز دوست کی وفات کی خبر آئی تو بہت لمبا اور دشوار سفر کر کے جلد سے جلد پہنچا۔ مرحوم میرے خطوط سینت کر رکھتے تھے۔ پہنچتے ہی کاغذات کا جائزہ لیا اور اپنے خطوط کا بنڈل قبضہ میں کر کے آگ کے حوالے کر دیا۔ خدا کرے اس قسم کے خطوط میں جن بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے پاس ہوں وہ ان کو تلف کر چکے ہوں وہ میرے اور ان کے درمیان پرائیویٹ گفتگو تھی جس کا مشتہر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ فائدہ کوئی نہیں فتنے کا امکان زیادہ ہے۔ میرے نزدیک اچھے خطوط وہ ہوتے ہیں جن کو شائع نہ کیا جا سکے۔ مجھے لکھنے پر جو قدرت حاصل تھی اس کی واقعی خوشی اس وقت حاصل ہوتی تھی، جب بے تکلف احباب مخلصوں اور عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھتا۔

خطوط کا اصلی جوہر خلوص اور اعتماد ہے۔ اپنا خلوص اور دوسروں پر اعتماد۔ خطوط میں قابلیت کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ شرافت، خوش طبعی اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔ بقول روسو علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے خلوص کی کمی کبھی علم سے پوری نہیں ہوتی۔"

("اپنی یاد میں"، مضامین رشید ص۸۱، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء)

رشید صاحب کے مضامین سے حسبِ ذیل اقتباسات بھی اُن کے مزاج اور الفاظ میں اُن کی ذات پہچاننے میں معاون ہوں گے :

"میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا، یا جس کو میں مظلوم و مجبور سمجھتا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بے جا کیوں نہ ہو عقل اور اخلاق دونوں سے گذر جانے میں تامل نہ کرتا۔ الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا خواہ فریقِ مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو (مضامین رشید ص۸۵)

"میری لغت میں تعطیل منانے کے معنی یہ تھے کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے، گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے، باغ میں کام کیا جائے، گھر کی صفائی کی جائے۔ ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے، یا دو چار وقت کا کھانا کھا لیا جائے، بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے، جو ملنے آئے اس سے کسی طرح سے بچا جائے، غسل کرنے کا اہتمام کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کی جائے، بڑا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض ادا کیے جائیں اور جو رقم بچ رہے اُسے لے کر بازار چلا جائے اور بے ضرورت چیزیں خرید لائے، مجھے قرض لینے اور اسے ادا کرنے کی خوشی ہوتی تھی۔ قرض کو میں فنونِ لطیفہ میں سمجھتا تھا، کب لیا جائے، کس سے لیا جائے، کس طرح لیا جائے، اس سے کس طرح دوستی بڑھائی جائے اور دشمنی ہٹائی جائے۔" (مضامین رشید ص۸۶)

ایک ریڈیائی تقریر میں رشید صاحب نے غالب کے خطوط اور شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ "ان رقعات سے ان کا پورا اعمال نامہ مرتب کر سکتے ہیں"۔ اسی سلسلے میں اپنے مخصوص رنگ میں انھوں نے صاحبِ طرز کے لیے ایک کسوٹی بھی پیش کی ہے۔ اس تقریر سے حسبِ ذیل اقتباسات شاید رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے طرز کے عرفان میں معاون ہوں۔

"میں اس شاعر یا ادیب کو اصلی معنوں میں صاحبِ طرز نہیں مانتا جس کے لکھنے کے انداز کی صرف چند دنوں واہ واہ رہے۔ صاحبِ طرز اس کو کہتے ہیں جس نے لکھنے کا ایسا انداز دریافت کیا جس میں لکھنے والے کے سلیقے اور شخصیت اور زبان وادب کے حسن وخوبی کا اظہار ملتا ہے۔ صاحبِ طرز شاعری اور ادب کے تعبدے

نہیں دکھاتا ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ صاحبِ طرز ہونے کی سب سے معمولی شرط یہ ہے کہ اس کے طرز کی عمر کچھ اور نہیں تو صاحبِ طرز کی عمر سے زیادہ ہو۔" (رشید احمد صدیقی، ایک ریڈیائی تقریر، مئی ۱۹۵۳ء، مشمولہ تحقیق نامہ شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور، شمارہ ۹۵-۱۹۹۴ء۔ ص ۷۲-۷۱)

"غالب کے صاحبِ طرز ہونے کی نشان دہی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے رقعات کے مطالعے سے ان کی شاعری اور زندگی کے تمام داخلی اور خارجی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے رقعات سے ان کا پورا اعمال نامہ مرتّب کر سکتے ہیں۔ الفاظ و عبارت کی دھوم دھام اور تام جھام سے آپ مرعوب نہ ہو جائیں تو خط لکھنے والے کی ذات آپ پہچان لیں گے۔"

"غالب کے ایسے خطوط بھی ہیں جن سے ان کی شخصیت کے بعض بڑے کمزور پہلو ظاہر ہوتے ہیں، ان خطوط پر پردہ ڈالنے اور غالب کو معصوم ثابت کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کوئی آدمی دنیا میں ایسا نہیں ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو، یہ اور بات ہے کہ ان کی کمزوریوں سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں۔" (تحقیق نامہ، شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور، شمارہ ۹۵-۱۹۹۴ء، ص ۷۳)

یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ رشید صاحب اپنے خطوں کی اشاعت پسند نہ کرتے تھے ان کی تاکید تھی کہ ان کے خطوط تلف کر دیے جائیں۔ اصغر گونڈوی مرحوم سے ان کی بہت دوستی تھی، جب ان کا انتقال ہوا تو وہ تعزیت کے لیے الٰہ آباد گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ اصغر صاحب ان کے خطوط بہت احتیاط سے رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان کا پلندہ نکلوایا اور خود ان خطوط کو ضائع کر دیا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے احباب اور عزیزوں کو اپنی اس رائے سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس مضمون کا ایک خط اخباروں کے لیے اپنی زندگی میں لکھا تھا۔ یہ خط 'رقعات رشید صدیقی' مرتّبہ مسعود حسین کے ص ۲۴۳ پر درج ہے۔ اس کے حاشیے پر مرتّب نے یہ نوٹ دیا ہے: "یہ خط دراصل ایک ٹائپ شدہ گشتی مراسلہ کا مسودہ ہے جو ایک 'معروضہ' کے عنوان سے رشید صاحب نے اُردو کے موقر اخبارات و رسائل کے مدیروں کی خدمت میں بھیجا تھا۔ تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسی کو نجی خط بنا کر مجھے ارسال کیا تھا۔"

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی

۲۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

مسعود صاحب مکرم و محترم ادب۔

بعض احباب نے میرے نجی خطوط جو وقتاً فوقتاً میں نے ان کو لکھے ہیں یا میرے فراموش شدہ مضامین نیز میری شخصیت کے خط و خال کو منظرِ عام پر لانے کی غرض سے رسائل و اخبارات کا خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جہاں تک پتہ لگ سکا ان عزیزوں کو بڑے ادب و اخلاص سے ممانعت کے عریضے لکھ دیے ہیں، لیکن قرائن سے پتہ چلا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے اس لیے آپ کے موقر اور کثیر الاشاعت اخبار یا رسائل سے اعانت کا خواستگار ہوں۔ چنانچہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ:

۱۔ میرے خطوط، نجی تحریریں یا متذکرہ بالا مضامین کی کسی بہانے اشاعت کی جائے، ان کو کہیں منتقل یا محفوظ کر دیا جائے، بلکہ ان کو یکسر تلف کر دینا میری عین شکر گذاری کا موجب ہوگا۔

۲۔ میری حیات میں یا مرنے کے بعد اخبارات، رسائل کے خصوصی نمبر شائع کیے جائیں۔

۳۔ میری یادگار قائم کرنے یا منانے کے لیے کسی قسم کا چندہ یا عطیہ قبول کیا جائے، یا پیغامات منگانے یا شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ میری اس درخواست کے خلاف جتنی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں ان سے میں ناواقف نہیں ہوں لیکن اس طرح کے مباحث میں پڑنا نہیں چاہتا صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ ان کو قبول فرمایا جائے۔

با ایں ہمہ اگر کسی نے اس گذارش کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر وہ کیا جس کے نہ کرنے کی میں نے التجا کی ہے تو میں ان کو اپنے نزدیک شریف آدمی نہ سمجھوں گا اور شاید وہ بھی نہ سمجھیں جو میری اس التجا کو آج یا مرنے کے بعد بھی چند دنوں قابلِ لحاظ فرمائیں گے۔

ہندوستان اور پاکستان کے جملہ اُردو اخبارات و رسائل کے مہتمم اور ایڈیٹر صاحبان سے گذارش ہے کہ اس معروضے کو بجنسہٖ ورنہ اس کا خلاصہ شائع فرما کر مجھے ممنونِ کرم فرمائیں گے ان کے کرم کو اپنے ممنون ہونے سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں۔

خاکسار

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کی اس واضح اور صریح ہدایت کے پیشِ نظر اب تک میں نے خطوط کا کوئی مجموعہ شائع نہیں کیا جو انھوں نے میرے نام لکھے تھے۔ اگرچہ میرے خیال میں یہ خطوط کسی طرح ان خطوط کے

کم ادبی اہمیت نہیں رکھتے جواب تک شائع ہوئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مجموعہ میں خاصی بڑی تعداد ایسے خطوں کی ہے جو رشید صاحب کی مکتوب نگاری کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ ان خطوط کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے بچوں کو لکھے تھے اور ان بچوں کے ایما سے ان کی اشاعت ہوئی ہے تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب اپنے نام ان خطوں کی اشاعت کو مزید التوا میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ اس لیے رشید صاحب کے انتقال کے انیس برس سے زائد کا عرصہ گذر جانے کے بعد اب ان کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ ہاں یہ مزور ہے کہ جب ان کو صاف کرنا شروع کیا تو ان میں سے پانچ خط رسالہ 'سوغات'، بنگلور میں دے دیے گئے تھے کہ لوگوں کو اس مجموعہ کی عنقریب اشاعت کا علم ہو جائے۔ میں رشید صاحب کی روح سے معذرت کے ساتھ خطوط کا یہ مجموعہ شائع کر رہا ہوں۔

اب تک رشید صاحب کے خطوط کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:
پہلا مجموعہ۔ مرتبہ سلیمان اطہر جاوید، جس میں مسعود حسین صاحب کے نام رشید صاحب کے خطوط جو مسعود حسین صاحب کے قیام حیدر آباد کے زمانے تک کے ہیں۔

دوم: خطوط بنام خلیق احمد نظامی۔

سوم: رقعات رشید صدیقی۔ مرتبہ مسعود حسین۔ اس مجموعہ میں وہ تمام خطوط ہیں جو سلیمان اطہر جاوید کے مرتب کردہ مجموعہ میں ہیں اور اس کے علاوہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۶ء تک کے خطوط بھی ہیں۔ میں نے اس بات کی تصدیق خود مسعود صاحب سے کرلی ہے۔

چوتھا مجموعہ لطیف الزماں خاں نے مرتب کیا ہے اور اس میں رشید صاحب کے وہ خط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے بچوں کے نام لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خط ان بچوں نے ہی فراہم کیے ہوں گے۔

حال میں (۱۹۹۵ء) رشید صاحب کے خطوں کا ایک اور مجموعہ منظر عام پر آیا ہے جس میں وہ مرقعے (چٹھیاں یا پرزے) ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں خلیل الرحمان اعظمی کو لکھے تھے۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کے کچھ خطوط بھی بعض رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ چونکہ رشید صاحب نے بہت خط لکھے ہیں۔ خاصی پابندی سے لکھے ہیں اور عرصہ دراز تک لکھے ہیں۔ اس لیے ان کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ سب منظر عام پر مزید آجائیں گے۔

میرے نام جو خطوط ہیں ان کی تعداد دو سو گیارہ ہے۔ ان سے پہلی ملاقات شروع نومبر ۱۹۳۲ء

یں ہوئی۔ میں اس وقت ایم۔ اے پریویس انگریزی کا طالب علم تھا۔ خواجہ منظور حسین صاحب نے جو اس وقت علی گڑھ میگزین کے نگراں تھے مجھے میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ میں مضامین حاصل کرنے کے لیے رشید صاحب، ستیدین صاحب، بشیر احمد ہاشمی صاحب اور دوسرے ادیبوں سے ملوں۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے شروع میں، میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ٹینس کلب کے سکریٹری بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میری طرف انھوں نے بہت کم التفات کیا زیادہ تر انھیں سے باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے انھوں نے صرف اتنا کہا کہ پہلے آپ اپنے نگراں سے دریافت کر لیجیے کہ میرا مضمون چھاپیں گے یا نہیں۔ میں نے جب خواجہ منظور حسین صاحب سے ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا قصّہ ہے تو وہ مسکرائے اور فرمایا کہ رشید صاحب کے مضمون "فلسفۂ ازدواج" پر کچھ لوگوں کی طرف سے احتجاج ہوا تھا اور اسی لیے انھوں نے کئی سال سے میگزین میں لکھنا بند کر دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ قصہ اب ختم سمجھا جائے اور رشید صاحب پھر میگزین کے لیے لکھیں۔ اسی لیے رشید صاحب کے پاس آپ کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد دسمبر میں یونین کے آل انڈیا ڈبیٹ میں میں نے علی گڑھ کی نمائندگی کی اور میری تقریر کو ڈاکٹر اشرف اور رشید صاحب نے پسند کیا۔ دونوں اس مباحثے کے جج تھے۔ اس کے بعد جب ملنے گیا تو رنگ ہی دوسرا تھا۔ انھوں نے میری تقریر کی بہت تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ آپ بے تکلّف مجھ سے ملتے رہیے۔

دسمبر ۱۹۳۳ء میں الکشن میں مجھے یونین کا وائس پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ پریسیڈنٹ اس زمانے میں پرو وائس چانسلر ہوتا تھا۔ میری رسم تنصیب چند دنوں بعد ہوئی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے شروع جنوری ۱۹۳۴ء میں رشید صاحب کا پہلا خط جو میرے نام آیا تقریب کے دوسرے دن ملا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا "اورنگ نشینی مبارک ہو۔ بقدر دو گونوں کے میں بھی متمتّع ہوا" یونین کی عمارت میں پیچھے کی طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں ڈیوٹی سوسائٹی کا دفتر تھا۔ دفتر کے لیے کچھ سہولتیں انھوں نے مانگی تھیں۔ افسوس ہے کہ باوجود تلاش بسیار کے یہ خط نہ مل سکا۔ اس کے بعد کے قریب قریب تمام خط محفوظ رہے اور اس مجموعے میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو چار خط اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں اُن کی تعداد زیادہ نہ ہوگی ان کی تلاش جاری ہے۔

یہ خطوط تقریباً چالیس سال کی مدّت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سے خط ایسے

ہیں جن میں رشید صاحب کے مخصوص اور منفرد اسلوب کی بڑی دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رشید صاحب کو اپنے خطوط کے شائع نہ ہونے پر کیوں اصرار تھا۔

خطوط میں انھوں نے آزادی سے بعض معاصرین کی تعریف کی ہے۔ بعض پر اعتراضات بھی کیے ہیں اور بعض پر طنز بھی۔ گویا یہ خط ان کے اس وقت کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے عام طور پر وہ مرنجان مرنج اور عافیت پسند تھے۔ نہ کسی سے الجھنا چاہتے تھے اور نہ کسی سے جھگڑا کرتے تھے۔ اگر کسی شخص سے بدحظ ہوتے تو اس سے ملنے سے گریز کرتے۔ اگر کسی محفل میں جہاں وہ ہوتے کچھ لوگ بحثا بحثی یا تلخ کلامی پر اتر آتے تو وہ یا تو خاموش رہتے یا وہاں سے اٹھ آتے۔ وہ روزانہ خاصی تعداد میں خط لکھتے تھے۔ شہر سے باہر خط لکھنا ہوتا تو عموماً پوسٹ کارڈ استعمال کرتے، لفافے انھوں نے بہت کم استعمال کیے ہوں گے۔ علی گڑھ میں مختلف لوگوں کو خط لکھتے تو رقعوں یا آئے ہوئے خطوں کے سادہ حصوں پر۔ عام طور پر ان کا ملازم سکندر ان کے خط شام کو اسٹیشن کے لیٹر بکس میں ڈال نے جاتا۔ رشید صاحب کی تحریروں میں وہ تحریریں جو خطوط کی صورت میں ہیں شاید سب سے زیادہ نکلیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ سوال ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ خط کس نے لکھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے بعد رشید صاحب کے خطوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔ ۱۹۵۵ء کے وسط میں جب رشید صاحب کو دل میں کچھ تکلیف ہوئی تو ذاکر صاحب نے جو یونیورسٹی کے کسی کام سے لکھنؤ آئے تھے مجھے یہ بتایا کہ اس دن رشید صاحب نے ایک درجن خط لکھے تھے۔

مکتوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی پڑھنے والے کی پوری توجہ کا مرکز بن جائے۔ رشید صاحب کو یہ گر آتا تھا۔ وہ کبھی کچھ دلچسپ فقروں سے اور کبھی کچھ مدحیہ کلمات سے پڑھنے والے پر ایک طرح کا جادو کر دیتے تھے۔ برسوں کی مشق و مہارت سے انھیں بڑی چست اور جاندار نثر لکھنا آگئی تھی۔ زیادہ تر لوگ اپنی تحریروں پر ان سے رائے مانگتے اور عموماً وہ لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے ان کی تحریروں کے متعلق کوئی دل خوش کن لفظ ضرور استعمال کر دیتے۔

ان خطوں میں سب سے زیادہ تذکرہ ذاکر صاحب کا ہے جنھیں وہ مرشد کہا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے تذکرے کے بعد غالباً رشید صاحب کے یہاں سب سے زیادہ ذاکر صاحب کی ہی حکایت شیریں ہے۔

رشید صاحب کو انتہا پسندی سے چڑ تھی۔ انتہا پسندی خواہ سیاست میں ہو خواہ مذہب میں ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے جس طرح ترقی پسندوں کو نہیں بخشا، اسی طرح مولانا عبدالماجد

کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ شروع میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے طرف داروں میں تھے۔ بعد میں کچھ اختلاف ہو گیا لیکن ان کے انتقال کے کچھ عرصے کے بعد ان کی قبر سے گزرے تو جس طرح انھیں یاد کیا اس کا میرے نام ایک خط میں بڑا دلدوز تذکرہ ہے۔

میں ۱۹۳۷ء میں بمبئی گیا تھا۔ ان دنوں میرے والد وہاں پوسٹ ماسٹر تھے۔ رشید صاحب کو بمبئی سے خط لکھا تھا جواب میں انھوں نے چوپاٹی کا ذکر کیا جس کے متعلق شبلی نے بڑے مزے کے اشارے کیے ہیں اور اس کے بعد مجھے ہدایت کی کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی "طاغوتیت" اور مولانا ماجد کی "یاجوجیت" دونوں سے ہوشیار رہوں۔ یہاں میرا خیال ہے کہ طنز نگار نہیں مزاح نگار بول رہا ہے۔ مزاح نگار زندگی کے نشیب و فراز سے لطف اٹھاتا ہے۔ طنز نگار انھیں ہموار کرنا چاہتا ہے (افسوس کہ یہ خط بھی اِدھر اُدھر ہو گیا۔ صرف اس کے کچھ فقرے یاد ہیں)۔

ان خطوط کے چند اقتباسات سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ رشید صاحب کے ان خطوط میں اپنے زمانے کے متعلق، معاصرین کے متعلق، مذہب، سیاست، صحافت، اُردو، مسلمان، اپنے کچھ مخصوص دوستوں سے مزاح المومنین اور ان کے علاوہ اپنی ذات و صفات کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ "ایک پیشہ ور والدین کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ یہ رقم آپ کی ضروریات کے لیے کافی ہو گی۔"

۲۔ "یہاں کا موسم بہت اچھا ہے، یعنی بارش بالکل نہیں اور ہوائیں نہایت دلپذیر۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی نہ ہو اور بیوی کے لطائف و ظرائف میسّر۔"

۳۔ "اتفاق سے اسی زمانے میں ذاکر صاحب المتخلص بہ وارد ھا کمیٹی دہرہ دون ہی میں تھے۔"

۴۔ "میری عقل مفلسی میں اور آپ کی عاشقی میں ماری گئی۔ میری دنیا خراب ہے۔ آپ عقبیٰ میں بھی قرۃ العین۔"

۵۔ "آپ سے اور ڈاکٹر ضیاء الدین سے بہت سے حساب چکانے ہیں وہ دن بھی آئے گا بفحوائے اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ باوجود اس کے کہ لاٹھی اللہ کے ہاتھ میں ہے کھبینس ڈاکٹر ضیاء الدینؒ اور سعید الدین صاحب کی ملکیت میں ہے لیکن بقول مولانا عبدالماجد اور ڈاکٹر عابد صاحب بین بجانے سے کیا حاصل جیسا کہ غالب نے کہا ہے ع

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی

۶۔ "جلیل صاحب کل صبح آئے تو میں ذرا دیر میں گھر سے باہر آیا۔ قمیص پھٹی ہوئی اور سلیپنگ سوٹ کا پائجامہ اس سے بھی زیادہ خستہ۔ دیکھ کر فرمایا آپ نے بڑا تکلف کیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ گھر میں ننگے ہی پھرتے ہیں۔

۷۔ "ستار خیری کی وفات کا مجھے بڑا غم ہوا۔ یہ شخص تمام عمر کسی نہ کسی دھن میں مبتلا رہا، غلط ہو یا صحیح، تمام عمر پریشان حال رہا لیکن مگن۔ سرور صاحب یہ بڑی بات ہے۔ یہ دھن ہی ہے جس کا موت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ پھر ڈاکٹر ضیاءالدین کس شمار میں ہیں"

۸۔ "آپ کو نہیں معلوم فاحشہ عورتیں جب اپنی عمر سے کھسک جاتی ہیں تو اپنے عشاق کو کس کس ڈھب سے قابو میں رکھتی ہیں"

۹۔ عام زندگی ان دنوں ذرا بے کیف گذر رہی ہے۔ کوئی راہ گذر یاد نہیں آتا"

۱۰۔ "میری جن اعلیٰ خوبیوں نے مجھے یہ دن دکھائے ہیں اس کی تلافی ان کتابوں سے کیسے ہو سکتی ہے جو محض میری ادنیٰ خوبیوں کا ایک جز ہیں۔ ان کتابوں کی آمدنی جس کو میں نے کبھی قیمت نہیں دی تو میری روزانہ کی تفریحات میں معین ہو سکتی ہے اور بس۔ یعنی کبھی دتی ہو آئے، کبھی کسی کی دعوت کر ڈالی، کبھی مولانا طفیل قسم کے لوگوں کو قرض دے دیا"

۱۱۔ "ابھی سورج نہیں نکلا ہے، کمرے میں سردی لگنے لگی ہے اس لیے کمرے سے باہر جانا چاہتا ہوں تاکہ سردی لگے تو دل بھی لگے۔ گذشتہ شام کو پالے کے ڈر سے میں نے اپنے بعض گلابوں پر میلے کپڑے وغیرہ ڈال دیے تھے اب جاکر دیکھوں گا کہ ان کا کیا حال ہے۔ وہ میرا اور میں ان کا آپ سے بہتر خیر مقدم کریں گے"

۱۲۔ "علی گڑھ عجیب جگہ ہے۔ یہاں اونٹ کروٹ نہیں لیتا، کروٹ اونٹ کا انتخاب کرتی ہے"

۱۳۔ "کیسا کیسا موسم گذر گیا، جب کچھ اور نہیں، اچھا سا فقرہ ہی کہنے کو جی ہوتا تھا"

۱۴۔ "کام بہت سارے اکٹھا کر لیے کرنے کا جی نہیں ہوتا اس لیے طبیعت بدحال رہتی ہے۔ پوچھیے گا اکٹھا کیوں کر لیے؟ اس کا جواب کیا دوں؟ کچھ شوق، کچھ مروت بہت کچھ بلکہ سب کچھ زبردستی ایک کو شروع کرتا ہوں اس سے نفرت ہو جاتی ہے، دوسرا شروع کرتا ہوں بیچ میں پہنچتا ہوں تو معلوم ہونے لگتا ہے کہ تیر نہیں رہا ہوں ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ اسے چھوڑتا ہوں تیسرا اٹھاتا ہوں۔ میاں رحم کرو کمزور مار کھانے کی نشانی"

۱۵۔ "حیات اللہ انصاری نے قومی آواز کا ۲۸ رجولائی کا پرچہ بھیج دیا۔ ایڈیٹوریل پڑھ کر طبیعت میں گدگدی پیدا ہوئی۔ سب کام چھوڑ کر پانچ سات صفحے لکھ ڈالے۔ پرسوں کے پانیر میں خبر دیکھی۔ پاکستان اور کشمیر ایک دوسرے سے ملوث ہیں۔ لکھنا بند کر دیا، طبیعت کھٹی ہوگئی۔ مسودہ پھاڑ دیا، معلوم نہیں میرے لکھنے کو حکومت یا ابنائے وطن کیا سمجھیں۔ ایسا کام ہی کیوں کیا جائے جس سے پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان ہو۔ کوئی یہ نہ دیکھے گا کہ کیا بات کہی کیوں کہی۔ سب کہیں گے احمق ہے، فضا کا رنگ نہیں دیکھتا۔ اب یہ کون کہے کہ فضا کا یہ رنگ نہ ہوتا تو مجھے حماقت ہی کیوں سوجھتی۔"

۱۶۔ "سبھی اپنی اپنی فکر میں ہیں اور ان کی فکر میں دوسرے۔"

۱۷۔ "یہ کاغذ ختم ہو گیا اور لاحول ولا قوۃ پر۔ اس سے بڑھ کر نیک شگون اور کیا ہوگا۔"

۱۸۔ "یہ الزام تو بے بنیاد سا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے خط لکھنے میں کوتاہی کی ہو۔ میں عورتوں اور مولانا ماجد کے خطوط کا بڑی پابندی سے جواب دیتا ہوں، عورتوں سے دنیا سنورتی ہے مولانا ماجد سے عاقبت۔ آپ حد اوسط ہیں اس لیے بگاڑ آپ سے بھی اچھا نہیں۔"

۱۹۔ نینی تال کی دلکشی اور اپنی کس مپرسی کا تذکرہ کر کے آپ نے میرے نفس کو اتنا خوش کیا کہ مجھے یہاں کے جہنم زار میں نینی تال کا لطف آگیا۔ نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا گویا کہ میں نہیں آپ۔"

۲۰۔ "اپنے خیالات کا اظہار یوں بھی تو کیا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات میرے ہیں۔ زید، عمر، بکر کے چاہے جو ہوں۔ اس سے تحریر میں وزن و وقار آتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے اپنے سے محبت بڑھ جاتی ہے۔"

۲۱۔ "چشتی کو میرا سلام پہنچا دیجیے ان کو میرا سلام کام نہ آئے گا تو وہ تو میرے کام آئیں گے۔"

۲۲۔ "آپ کو توچور ہونے کی سعادت کبھی حاصل نہ ہوئی، لیکن میرا پھیری میں ماجد صاحب سے بھی آگے نکل گئے۔"

۲۳۔ "نفس بھی کیسا کیمونسٹ ہے کیسے کیسے بھیس میں کہاں کہاں نظر آتا ہے۔"

۲۴۔ "برسات یہاں دیر میں پہنچی لیکن بھرپور سی پہنچی۔ آج صبح کا سماں کچھ ایسا ہے جیسے آپ قطعاً بوڑھے اور میں قاطعتاً نوجوان ہوں۔"

۲۵۔ "دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ کیا نتیجہ نکالنے کے لیے کس نے کیا PREMESIS دئے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر کون ہمدردی یا انصاف کرنا چاہتا ہے اور کون صرف پھانسی دینا چاہتا ہے۔ تنقید میں یہ امور بڑے اہم ہیں جن کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔"

۲۶۔ "قسمت کا کھیل آدمی کو بدلتا نہیں صرف بے نقاب کر دیتا ہے اور بے نقاب ہونے کی آزمائش معمولی آزمائش نہیں ہے۔"

۲۷۔ "ہندو میتھالوجی میں نیل کنٹھ مہادیو کا قصہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ آج مرشد سے کہوں گا کہ میں کچھ دنوں کے لیے مرشد کا خطاب واپس لیتا ہوں اور نیل کنٹھ مہادیو کا پیش کرتا ہوں۔"

۲۸۔ "میں نے جو یہ کہا تھا کہ آپ تنہا اُردو ادب کا حسرت نمبر نکال سکتے ہیں اس کا ہر مضمون معیاری ہوگا۔ آپ جتنی دیر میں چار مضمون لکھیں گے میں اتنی دیر میں ایک مضمون بھی نہ لکھوں گا۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے جب میں مانتا ہوں۔ البتہ جب کبھی آپ ترقی پسندی کے طوفان میں ڈگمگانے لگتے ہیں تو مجھے تردد ہونے لگتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ در اصل میں خود اپنے کو سب سے زیادہ ترقی پسند سمجھتا ہوں۔"

۲۹۔ "اس واقعہ کی اطلاع میں سلطان صاحب کو دوں گا اور پھر وہ سنائیں گے اپنے خاندانی عطروں کا قصہ۔ جس میں ایک یہ ہے کہ ان کے یہاں کے عطر لگے میلے کپڑے دھوبی کے ہاں جاتے تھے تو دھوبی کے ہاں جتنے کپڑے جہاں کہیں کے آئے ہوتے سب معطر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچتے۔"

۳۰۔ "اقبال ڈے" کی صدارت نہ کرنے پر آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اولاد اور اشعار میں دن دونی رات چوگنی ترقی دے گا۔"

۳۱۔ "آپ شاید میری کمزوری سے واقف نہ ہوں۔ یہ کہ میں رائے دینے میں رائے لینے والے کا نفع زیادہ دیکھتا ہوں، قوم وغیرہ کا کم دیکھتا ہوں۔"

۳۲۔ "آپ تو جانتے ہیں تنقید وغیرہ کا میرا علم بالکل کتابی ہے نتی نہیں ہے۔ میں تو اپنے تاثرات پر جاتا ہوں اور اسی کو اپنا سب سے قوی پوائنٹ سمجھتا ہوں۔"

۳۳۔ "سب سے اوپر آپ کا کارڈ رکھا ہوا تھا اس کو اس نیت سے پڑھنا شروع کیا کہ آپ نے کوئی ترقی پسندی کی بات لکھی ہوگی۔ آپ ہی کو بُرا بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا کر لوں گا۔ اس کے

بعد اُم ٹھنڈے کرنے کی فکر کروں گا. لیکن پڑھ کر مایوسی ہوئی. نہ آپ نے انقلاب کا ذکر کیا تھا نہ مولانا ماجد کا نہ سمپورنانند کا. دل بجھ گیا. ہائے کیسے دن آ گئے کہ سرور صاحب بھی باعثِ اشتعال نہ بن سکے. ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ پٹا کرتے تھے۔"

۳۴۔ "اور سرسید جن دقتوں میں مبتلا تھے اس کے مقابلے میں ذاکر صاحب کی دقتیں بدرجہا زیادہ ہیں. سرور صاحب! ہندوستان کو دوسرا اسپین بننے سے بچانا ہے. کام کتنا مشکل ہے لیکن کس درجہ وجد آفریں اور حوصلہ انگیز۔"

۳۵۔ "لکھنے کو تو یہ سب کچھ لکھ گیا اب خیال آیا کاش! یہ خط کسی محبوبہ کو لکھا ہوتا جس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا. اس لیے کہ محبوبہ اکثر احمق ہی ہوتی ہے لیکن پھر 'نگار' تو ہے۔"

۳۶۔ "واللہ آپ نے نقصان نہیں. جنوں سے جو سودا کرے کوئی گو بنئے سے نسبت دے کر بقول مخدومہ "کمال یا حدی" کردی تعریف نہیں کرسکتا. یہ اسپرٹ مہدی عباس حسین صاحب مرحوم کی ہے. جنھوں نے روپے کا توڑا اسن کرائی شکایت واپس لے لی تھی۔"

۳۷۔ "ذاکر صاحب نے صدارت کی. میں نے مانگے کا ایک نہایت ہی بوسیدہ اور میلا گون پہنا. یونین والوں نے تالی بجائی اور میں نے نائی کے نوتنے کی طرح جمانوں کو سلام کیا اور مقالہ پڑھا." (۴ ستمبر ۱۹۵۴ء)۔

۳۸۔ "محرم گذر گیا. اب اس مضمون کا ماتم بھی ختم کر دیجیے. لعنت ہے اس رعایت لفظی پر. لیکن لعنت بھی تو اس رعایت سے ہے۔"

۳۹۔ "یہ جو پھولوں کے سلسلے میں آپ گل رخوں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو خوفناک جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے. کچھ بھی ہو اب میں بالکل نہیں چاہتا کہ آپ میرے لیے پھولوں کا انتظام کریں. خدا کرے آپ کا کوئی تنقیدی مقالہ ہو اور حاضرین میں صرف حاذق صاحب سننے والے ہوں۔"

۴۰۔ "یہ نزلہ زکام کب تک آپ پر مسلّط رہے گا. بعض امراض بھی کتنے بدمذاق ہوتے ہیں. ڈاکٹر علیم صاحب کی طرح. کہیں وہ تو آپ کی شاعری کا معتقد نہیں ہو گیا.

۴۱۔ "حج کے بارے میں کسے معلوم کہ کیا ہوگا. البتہ یہ یقین ہے کہ میں حج کو جاؤں یا نہیں بہت سارے حاجیوں سے انجام اچھا ہوگا. چاہے جنت میں جاؤں چاہے جہنم میں. آپ دیکھیے گا آخرت میں بھی بہت سارے حاجی جنت ہو یا جہنم. ٹک ہی پر جلوہ افروز ہوں گے اور حوروں کی جگہ ایئرہوسٹس قسم کی چیز ملے گی. اکثر حاجیوں کے اعمال دیکھتا ہوں تو اس قسم

لغو خیال ذہن میں آتے ہیں اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں؟

۴۲۔ "ایک جگہ حسرت کا شعر دیکھنے میں آیا۔ اتفاقاً جبینِ یار پر غصّے میں حسرت فروزاں ہے جمالِ سرگرانی۔ دوسرا مصرعہ کتنا عجیب و غریب ہے؟"

۴۳۔ "یہ آپ نے کیا کہا کہ آپ ادب برائے زندگی اور میں خالص ادب کا قائل ہوں۔ آپ نے مجھے غلام امام شہید یا نوح ناروی کیوں سمجھ لیا ہے۔ ادب یا زندگی ترقی پسندوں کے نزدیک دو حقیقتیں ہوں گی۔ پیغمبروں کے یہاں یہ ایک ہی چیز ہے۔"

۴۴۔ "اچھا فقرہ، فقرہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یا واقعے کی بشارت ہوتی ہے اور حقیقت یا واقعے کی بشارت شاعر یا ادیب زندگی کو دیکھ کر، پرکھ کر اور سو فیصدی یقین رکھ کر کرتا رہا ہے۔"

۴۵۔ "سرور صاحب جس چیز کو آپ ادب برائے زندگی کہتے ہیں وہ دراصل زیادہ سے زیادہ ادب برائے تحریک ہے۔ تحریک سے میرا مطلب مثلاً اشتراکیت ہے۔"

۴۶۔ "میں سخت دنیادار آدمی ہوں لیکن کیا کروں ادب اور زندگی کی بہت سی باتیں دیکھی اور جھیلی ہیں۔ کوئی معقول آدمی مل جاتا ہے تو کہے بغیر نہیں رہا جاتا ہے۔"

۴۷۔ "آپ کیوں بددل ہوں۔ خدا آپ کے ساتھ ہے، تمام شرفا آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ بھی اپنا ساتھ نہ چھوڑیے۔"

۴۸۔ "آج یہاں کا موسم ہے کہ مولوی کی فطرت۔ کچھ گرمی، کچھ حبس، کچھ خنکی، کچھ اُتر پردیش کی منسٹری۔"

۴۹۔ "کچھ ایسا خیال آتا ہے جیسے عورتوں کی ایک قسم دسہری ہوتی ہے اور دسہریوں کی ایک قسم ڈی۔ پی مکرجی ہیں۔"

۵۰۔ "جگر صاحب کا مجموعہ میرے بالکل کام کا نہیں ہے۔ وہ میں آج سے بہت پہلے بھیج دیتا۔ اب انشاءاللہ کل بھیج دوں گا۔ آپ اسے دیکھیے اور لکھ ڈالیے۔ میں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کلام دیکھ کر نہیں لکھتا آدمی دیکھ کر لکھتا ہوں۔"

۵۱۔ "آپ کو یہ نعمت حاصل ہے کہ آپ کی نثر کو شاعری سے اور شاعری کو نثر سے توانائی اور دلکشی ملتی رہتی ہے اور آپ دونوں کو اپنی حدود سے تجاوز کرنے نہیں دیتے۔"

۵۲۔ "آپ کی متعدد مملکتوں میں کہیں سکندر کے لیے کوئی گنجائش ہے بڑی حسرت سے کہتے تھے کہ اتنے تعلقات ہونے پر نہ بیوی میسّر آئی نہ نوکری۔"

۵۳۔ "ڈاکٹر صاحب تسبیح پڑھیں گے اور دعا مانگیں گے تو امید ہے میری صحت اور آپ کا چال چلن اعتدال پر رہے گا۔"

۵۴۔ "کس درجہ اپنے سے نلاں ہوں (بقول پنجابی خواتین) کہ پہلے سے معلوم کرنے کا کیوں انتظام نہ کر سکا۔"

۵۵۔ "جو حرکت سب کرنے لگتے ہیں اس کے کرنے کا بالکل جی نہیں چاہتا۔ یہ اور بات ہے کہ سیاست درباں سے ڈر کر کبھی کبھی بقول شخصے کرنے لگ جاؤں۔"

۵۶۔ "مجھے اشعار اکثر غلط ورنہ ٹکڑوں میں یاد رہتے ہیں۔ کسی کے دو ایک فقرے، کسی کا صرف مفہوم۔ ایک زمانے میں رفقائے شعبہ قریب ہوتے تھے ان کی مدد سے ان کو سالم یا سموچا کر لیا کرتا تھا۔ وہ سہولت نہ رہی تو پھر اب کون کرے۔"

۵۷۔ "ایک مُلا ہے کے چوتڑ پر تیر آ کر لگا وہ اسے پکڑے پکڑے پھرتا اور کہتا "اللہ میاں کاش نہ لگا ہو"۔ اس طرح کہ "شُبھ کا منائیں" (زیدی صاحب اس فقرے کے بڑے دلدادہ ہیں) ایک مُلا ہے ہی کے ذہن میں آ سکتی ہیں۔"

۵۸۔ "یہ آپ کی لکھنؤ یونیورسٹی کے رجسٹرار کون بزرگ ہیں۔ ان کی شان میں اکثر ناسزا برجستہ کلمات زبان پر آ کر رک جاتے ہیں۔ ان کی شان میں پہلے فارسی میں کلماتِ خیر زبان پر آتے تھے جیسا کہ ہادی صاحب پدر سوختہ وغیرہ کہتے رہتے ہیں۔ اب خالص کھڑی بولی میں آنے لگے ہیں سیکولر اور جمہوری۔"

۵۹۔ "آپ کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست و عزیز ہیں جو لکھنے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں ان سے بھی بڑے دُکھ اور شرمندگی سے معذرت کرتا رہتا ہوں۔ یقین مانیے یہی میری کمائی و متاع رہ گئی ہے اور یہ سب کو معلوم ہے۔"

۶۰۔ "مجھے سب سے زیادہ فکر ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کی ہے اس لیے کہ آپ کی فرمائش پر میں نے ان کی رضامندی کے لیے خط بھیجا تھا تو انھوں نے فون پر اپنی رضامندی بھیج دی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کا انتخاب ضرور ہو جائے۔۔۔ آپ کل کے انتخاب کے بارے میں خصوصی توجہ اور باہمی مشورے سے کام لے کر روبراہ فرما دیں۔"

۶۱۔ "ذاکر صاحب پر کچھ لکھنے کی فرمائش موصول ہوئی تھی۔ ان دنوں طبیعت کا جو حال ہے اس میں اس طرح کا کام کرنا میرے لیے بڑا مشکل ہے اس لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں ان پر کچھ لکھنا اور لکھتے رہنا اچھا بھی معلوم ہوتا تھا اور آسان بھی تھا۔ اب تو کچھ ایسا حال ہے کہ اچھا کام کرنے کا بھی جی نہیں چاہتا ؂

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

۶۲۔ "اس دن جو گفتگو ہوئی تھی اس کے سلسلے میں عرض ہے کہ ابھی اس تقریب کی تاریخ متعین کرنے میں جلدی نہ کیجیے گا۔ ان دنوں طبیعت خراب ہے۔ اعتدال پر آ جائے تو اطلاع دوں گا۔ تاریخ اور وقت مقرر فرما لیجیے گا" (یکم مارچ ۱۹۷۲ء)۔

۶۳۔ "میٹنگ کرنے میں جلدی کیوں کیجیے۔ اس درمیان میں کوئی اور تقریب کر لیجیے۔ مرسلہ تحریر واپس فرما دیجیے۔ جا بجا اصلاح اور کمی بیشی کرنا چاہتا ہوں۔"

۶۴۔ "آپ مجوزہ تقریب کو آئندہ سیشن کے لیے ملتوی فرما دیجیے۔ ... اس میں قصور تمام تر میرا ہے۔ آپ پر قطعاً کوئی اور کسی طرح کا الزام نہیں کہ تقریب ملتوی ہوتی ہے اور ہو گی (۲۰ اپریل ۷۲ء)

۶۵۔ "صورتِ حال میں جو نزاکت پڑنے والی ہے اس کو آپ ہی اعتدال پر لا سکتے ہیں۔ ورنہ مخالفوں کو جامعہ کو بدنام کرنے کا بڑا آسان اور موثر موقع ہاتھ آ جائے گا۔" (۲۸ جنوری ۷۳ء)

۶۶۔ "میری رائے یہ ہے کہ یہ بہتر ہو گا اگر نامزدگی کا پرچہ پہلے سے آپ اپنے قبضے میں کر لیں۔ معلوم نہیں عین وقت پر کون موجود رہے اور کون نہیں۔" (۲۱ جنوری ۷۳ء)

۶۷۔ وہ جو آج .... فلاں صاحب کے تعمیر مکان کے سلسلے میں لطیفہ ہوا تھا اس کا اتفاقاً بھی کہیں کسی سے تذکرہ نہ کیجیے گا خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا (غالباً جولائی ۷۲ء)۔

۶۸۔ "آپ نے "ماہِ نو" میں وہ نظم دیکھی جس کا تذکرہ میں زبانی کر چکا تھا۔ ماہِ نو کو بھی بھیج چکا ہوں۔" (۱۹ جولائی ۱۹۷۳ء)۔

رشید صاحب نے خود لکھا ہے کہ میں نے خطوں سے بڑے کام نکالے ہیں۔ پطرس نے مجھے ایک خط میں ۳۵ء میں لکھا تھا:

"رشید صاحب کی تحریر در مدح ڈاکٹر ضیاء الدین دیکھی۔ ایسی چست نثر اب دیکھنے میں کم آتی ہے۔"

جب مولانا سورتی کا انتقال ہوا تو رشید صاحب نے ان کے بیوی بچوں کی امداد کے لیے اپنے بہت سے احباب کو خطوط لکھے اور ان کی اپیل کا خاصا اثر ہوا۔ صرف مولانا عبدالماجد نے میرے نام ایک خط میں نکتہ چینی کی تھی اور یہ کہا تھا رشید صاحب کسی یتیم خانے کے نگراں نہیں ہیں۔

جو وہ اس قسم کے چندے کی فراہمی کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ اُن کے پاس اکثر رسالوں کے ایڈیٹروں کے خط مضمون کی فرمائش کے لیے کثرت سے آتے تھے لیکن ایسی فرمائش انھوں نے شاید دس میں سے ایک پوری کی ہو۔ لوگ اپنی کتابیں اُن کے پاس رائے کے لیے بھیجتے تھے پوری کتاب پڑھنے کا توان کو کم ہی اتفاق ہوتا۔ لیکن ایک نظر ڈال کر اور اِدھر اُدھر سے دیکھ کر رائے ضرور دے دیتے تھے۔ عام طور پر اس رائے میں حوصلہ افزائی یا ہمت افزائی کا پہلو زیادہ ہوتا تھا۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا بھی ہے:

"کسی کی تعریف کرنے میں میرا کیا جاتا ہے اس کا دل خوش ہوتا ہے میرا کام بن جاتا ہے۔"

عام طور پر وہ پوسٹ کارڈ پر ہی لکھتے تھے، لفافہ کبھی کبھار لکھتے تھے۔ کئی جگہ انھوں نے اس کی شکایت کی ہے "کارڈ ختم ہوگیا اور لاحول ولا قوۃ، پر اب ذرا طبیعت موزوں ہو چلی تھی۔"

قدرتی طور پر ان کے ایسے خطوں کی تعداد زیادہ ہے جو مجھے اس زمانے میں لکھے گئے تھے جب میں رام پور اور لکھنؤ میں تھا۔ جب دسمبر ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ واپس آیا تو خطوط کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ پھر بھی ۱۹۷۱ء، ۷۲ء، ۷۳ء کے خطوط سے یہ بات واضح ہے کہ اس وقت بھی وہ بہت سی باتوں کے سلسلے میں مجھ پر کتنا اعتماد کرتے تھے۔ ۷۴ء، ۷۵ء، ۷۶ء میں میرا وقت بیشتر شملہ میں گذرا۔ جاڑوں میں علی گڑھ آتا تھا۔ ۷۳ء تک ان سے ملاقاتیں رہیں۔ آخری ملاقات شاید ڈاکٹر علیم کے دولت کدے پر ہوئی تھی جو اس زمانے میں وائس چانسلر تھے۔

رشید صاحب کا انتقال ۱۵ر جنوری ۷۷ء کو ہوا۔ شروع جنوری میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا انتقال ہوا تھا اور رشید صاحب نے ان کے انتقال پر ان کے پس ماندگان کو تعزیت کا خط بھی بھیجا تھا غالباً یہ ان کا آخری خط تھا۔

میرے نزدیک اب تک رشید صاحب کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کے مقابلے میں خطوں کے اس مجموعے کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس میں ان کے اسلوب کے اور ان کی شوخیِ فکر کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ ان میں انھوں نے بعض شخصیتوں پر بے تکلف تبصرہ بھی کیا ہے وہ مذہبی آدمی تھے مگر کٹر پن اُن میں بالکل نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ ہر طرح کی انتہا پسندی سے بہت دور تھے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ ان کے یہ خطوط گویا تہذیب، معقولیت، شرافت اور بھلمنساہت کے صحیفے ہیں۔ رشید صاحب اصولوں کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ کہتے تھے انتخاب میں میرا ووٹ ذاتی تعلقات کی بنا پر ہوگا خواہ مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو۔ مشہور انگریزی ناولسٹ

ای۔ ایم فارسٹر کی طرح رشید صاحب بھی انسانی رشتوں کو سیاسی اور سماجی رشتوں سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر میں گذرتا تھا۔ جن سے خصوصی مراسم تھے اُن سے تو مل لیتے تھے لیکن ہر کس وناکس کو وہ ٹال ہی جاتے تھے۔ شام کو ایک زمانے میں حمیدالدین خاں صاحب کے یہاں بزم احباب میں کوئی گھنٹہ بھر بیٹھتے تھے پھر اپنے دوست اصغر علی حیدر کے یہاں کا پھیرا ان کا روز کا معمول بن گیا، ان کے یہاں برج کی محفل بھی جمتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد برج کھیلنے کے لیے اسٹاف کلب جانے لگے۔ ذاکر صاحب جب وائس چانسلر تھے تو عموماً ایک پھیرا اُن کے یہاں بھی شام کو ہو جاتا تھا۔ آخر زمانے میں مختلف عوارض کے شکار رہے اور اس زمانے کے خطوں میں ان کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے لیکن ہاتھ میں رعشے کے باوجود وہ لکھتے آخر زمانے تک رہے۔ ان کا خط نہایت پختہ، پاکیزہ اور ہموار تھا۔ ہائی اسکول کے بعد ہی انھوں نے کچہری میں کلرکی کر لی تھی اور نقل نویسی کے کام پر مامور کیے گئے تھے۔ اس مشق و مزاولت کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک پختگی اور ہمواری آگئی تھی۔ ایسے خطوں کی تعداد خاصی ہے جس میں انھوں نے تاریخ تو لکھی ہے لیکن سال نہیں لکھا۔ ایسے سارے خطوں کا سال یا تو سیاق وسباق کی مدد سے یا ڈاک خانے کی مہر سے متعین کیا گیا ہے۔

ان خطوں میں چند ایسی باتیں بھی ہیں جو بعض شخصیتوں اور واقعات کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ۱۰ر جون ۴۵ء کے ایک خط میں لکھا ہے:

"حال کا واقعہ یہ ہے کہ حمیدہ سلطان عرف چھمی بیگم مصنفہ ثروت آرا بیگم اپنے بھائی فخرالدین صاحب کے ساتھ جو کانگریس منسٹری میں آسام میں وزارت پر فائز تھے اور ۲۲ مہینے کی قید و بند سے آزاد ہوئے تھے، تشریف لائیں اور فخرالدین صاحب نے سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی عابدہ سلطان کو شادی کی انگوٹھی پہنائی"

فخرالدین احمد صاحب بعد میں صدر جمہوریہ ہوئے۔ ان کی توجہ سے ہی غالب انسٹی ٹیوٹ وجود میں آئی۔ ایک اور خط میں جو ۱۲ر فروری ۴۶ء کا ہے لکھتے ہیں:

"شریف صاحب، حیدر خاں اور قریشی صاحب پروفیسر ہو گئے۔"

یہ یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ تھے۔ ۲۶ر جنوری ۴۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اس ایک مہینے میں ڈاکٹر ضیاءالدین پر کیا گذر گئی، علی گڑھ کن منازل سے گذرا، میں کہاں ہوں، مسز رحمت کیا ہوئیں، عمرالدین کا کیا ہوا، جلیل صاحب کس عالم

میں ہیں، حکیم صاحب کس رفتار سے جا رہے ہیں۔ غرض یہ داستان کون سنائے، کب تک سنیے گا؟"

۲۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء کے خط میں فرماتے ہیں:

"پرسوں یا کل ایک خبر پڑھی تھی کہ مولانا آزاد ایجوکیشن ممبر (منسٹر) ہو گئے ہیں اور ہاں آپ ان سے مل بھی تو چکے ہیں، معلوم نہیں غریب کی قسمت میں اور کیا لکھا ہے؟"

شاید رشید صاحب کو مولانا کا وزیر ہونا اچھا نہ لگا تھا۔

مولوی عبدالحق صاحب اور رشید صاحب کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ رشید صاحب مولوی صاحب کا احترام کرتے تھے۔ مگر مولوی صاحب رشید صاحب اور شعبۂ اُردو پر اعتراض کرنے سے چوکتے نہیں تھے۔ جب ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں اُردو کانفرنس ہوئی تھی تو اگرچہ اس کے انتظامات میں رشید صاحب کا سب سے زیادہ دخل تھا مگر مولوی صاحب اپنی تقریروں میں شعبۂ اُردو کے متعلق اور ان کے متعلق کچھ نہ کچھ طنز کرتے ہی رہتے تھے۔ چند سال بعد جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی علی گڑھ میں ہوئی۔ اس موقع پر کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مولوی صاحب نے یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو پر خاصے اعتراضات کیے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کے خط میں رشید صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحق صاحب کا خط میرے خط کے جواب میں میرے پاس بھی آیا تھا۔ موصوف کے بارے میں آپ کا اندیشہ صحیح ہے۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب کی بھی رائے یہی ہے۔ میری رائے آپ جانتے ہیں۔ شعبۂ اُردو کو وہ جہاں تک رسوا کر سکتے تھے کر چکے اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں کر سکتے۔"

اسی خط میں انھوں نے اُردو رسم خط کے بارے میں اپنی رائے لکھی ہے

"بمبئی کے کچھ اُردو دوستوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ دیوناگری رسم خط کو اپنا لیا جائے۔"

رشید صاحب اس کے خلاف تھے۔ اسی خط میں فرماتے ہیں:

"رسم خط کے بارے میں میری اب بھی رائے ہے کہ اسے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ آپ یقین مانیے اُردو کے لیے اُردو کا رسم خط اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ مصلحت کو مدِنظر رکھنا دانش مندی ضرور ہے لیکن ہمیشہ مصلحت ہی کو دیکھتے رہنا یا مصلحت پیدا کرنا کم ہمتی اور عدم خلوص کی بنا پر بھی ہوتا ہے ـ ـ ـ ہندی والے یہ تو گوارا کر لیں گے اور یہ بات ان کی سمجھ میں آ سکتی ہے

کہ مسلمان یا اُردو والے اُردو رسمِ خط کیوں قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ یقیناً اس امر پر بدکیں گے اور بدکنا چاہیے کہ اُردو والے رومن رسمِ خط کیوں استعمال کر رہے ہیں اور یہ بات کبھی سوچنے کی ہے کہ اگر ہم ہندوستان والوں سے الفت رکھتے ہیں تو ہم کو ناگری رسمِ خط قبول کرنا چاہیے۔ اگر مسلمان ممالک اور مسلمانوں سے رشتہ رکھتے ہیں تو اُردو رسمِ خط رکھیں یہ رومن رسمِ خط کہاں سے آگئے؟

۱۶ر جنوری ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وفد کا خیال اچھا ہے یہ کام ضرور کر ڈالیے آپ ہی کر سکتے ہیں۔ مجھے اس کام میں نہ گھسیٹیے۔ میں مولوی صاحب کے ساتھ نہیں ہونا چاہتا، میرا دل ان سے کھٹا ہو چکا ہے میں ہر ایسے موقع سے ان سے بچنا چاہتا ہوں جہاں ان کا ہیچ ہو۔ آپ یونیورسٹی یا کانفرنس کو لکھ کر یا لکھوا کر نمائندہ طلب کر سکتے ہیں میں البتہ کہیں سے نہ جاؤں گا۔ مولوی صاحب کو آبرو لوٹنے میں جو مزہ ملتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں اور آپ نہیں جانتے ہیں ایسے آدمی کیا کیا نہ کر گذریں۔"

۱۹۴۷ء کے فسادات کے متعلق کس درد و کرب میں ڈوب کر لکھتے ہیں:

"دلی والوں پر کیا گذر گئی، خود پنجاب پر کیا گذری اور اس وقت بھی کیسی کہاں گذر رہی ہے یا آئندہ کیا ہونے والا ہے کون بیان کر سکتا ہے سوچتا ہوں تو سر چکرا جاتا ہے۔ بتائیے تو انسانیت کہاں گئی، ہزاروں برس سے ہم کس فریب میں مبتلا چلے آئے ہیں۔ علم تہذیب، ترقی، مروت، انصاف، رحم، آخرت اور اس قبیل کے تمام تصورات کتنے غلط اور بودے ثابت ہوئے۔ پھر ہندو، مسلم، سکھ کیسے کیسے اشقیا سے پالا پڑا ہے۔ ان درندوں میں کیسے کیسے زہر اور کتنا تعفن بھرا پڑا ہے۔ ایٹم بم سے کیوں لوگ اس درجہ خائف ہیں جب دنیا میں ایسی وبا پھیل چکی ہے جس کو ہندو، مسلم اور سکھ کہتے ہیں۔"

اسی خط میں انھوں نے نواب اسماعیل خاں صاحب کے وائس چانسلری کا چارج لینے کا ذکر کیا ہے اس کے بعد لکھا ہے:

"جب تک نواب صاحب آئے نہ تھے میں نے کس کس طرح ہاتھ مارے ہیں اور کتنے ہاتھ جوڑے کہ فلاں فلاں باتیں کہہ ٹالی جائیں اور کر ڈالی جائیں، کسی نے

میری نہ سنی بالکل وہی باتیں ٹھیک اسی طرح اور انھیں الفاظ میں جو بھی لکھ لکھ کر دیتا تھا اور منہ سے کہتا تھا اور سر ٹیکتا تھا لیگ کے لیڈروں نے اب کہنا شروع کیا ہے لیکن وقت نکل چکا تھا اب کہنا بے کار ہو گیا۔"

اس زمانے میں علی گڑھ میں جو سراسیمگی تھی اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کا حال نیا نہیں ہے ایک مدت سے تو آپ کو معلوم ہے، علی گڑھ کی اپنی رائے نہیں رہ گئی تھی۔ سمجھ دار لوگوں کی کوئی سنتا نہ تھا بلکہ الٹا انھیں ذلیل اور غدار سمجھا جاتا تھا اب جب کلاس کا انجام آنکھوں کے سامنے آیا ہے تو آگے پیچھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ جو لوگ اپنے ایمان پر بھروسہ رکھتے ہوں نہ عقل پر مصیبت اور CRISES کے وقت کب ایمان یا عقل سے کام لیں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ نہ ان کو گالی دے سکتا ہوں نہ ان پر ہنس سکتا ہوں۔ مدد کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ایسوں کی مدد کرنا بھی اخلاقاً واجب نہیں، لوگ ہیں کہ بھاگنے کی فکر ہیں، ہزار بہانے حق بجانب ہونے کے تراشتے ہیں لیکن یہ موضوع ایسا نہیں ہے کہ اس پر دیر تک وقت ضائع کیا جائے۔"

اسی خط میں آگے چل کر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے متعلق لکھا ہے:

"اس سارے خلفشار میں مجھے تو جواہر لال نہرو کا کیرکٹر بڑا ہی عظیم الشان نظر آیا۔ گاندھی جی تو ظاہر ہے جیسے ہیں ان کی تعریف اور بڑائی کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ان باتوں سے بہت دور اور بہت اوپر پہنچ چکے ہیں۔ اکثر سوچتا ہوں ہندوستان ایسے گھٹیا ملک میں اتنی بڑی شخصیت کیوں کر جلوہ گر ہوئی۔ ہاں تو میں نہرو کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اس ہنگامے میں ان کی بہادری، بے جگری اور بے لوثی کے افسانے کتنے سنے گئے۔ لیکن میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب اس شخص کے قلب کی انتہائی گہرائی سے آنسو کلمے بن کر نکلتے ہیں۔ درندوں کے ہجوم میں پہنچ کر جب وہ کہتا ہے "اے لوگو! کیا اسی دن کے لیے ہم سب نے پچیس تیس سال تک زندگی کی تلخیوں کو جھیلا ہے" تو میرے سامنے اس شخص کی پوری زندگی آجاتی ہے۔ جب اس نے نفس کے ہر مطالبے کو ملک کی برتری اور بہتری کے لیے اپنے ہاتھوں سے پھونک کر خاکستر کیا

زندگی کی معمولی سے معمولی نعمت کو لوگ ہاتھ سے نہیں دینے۔ اس شخص کو دیکھیے اس نے ہر نعمت کے بدلہ میں محنت، مایوسی، تعزیر کا انتخاب کیا۔ اب دیکھتا ہے تو خرمن میں آگ لگی ہوئی۔ اس کے بعد سوچیے جواہر لال جیسا آدمی زار و قطار روتا ہو اور کہتا ہو کہ " اے درندو! کیا اسی دن کے لیے ہم نے محن اور مایوسی کے پچیس تیس سال گذارے "

رشید صاحب ہمیشہ لیڈر اور نیتا پر لعنت بھیجتے رہے۔ ایک دفعہ ان کی طبیعت میں گدگدی سی پیدا ہوئی۔ اصغر صاحب کے گھر تک پہنچے تو تقریر اور جدوجہد کی ساری اسکیم ان کے ذہن میں مستحضر تھی۔ وہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے قربانی، لا اکثی، علی گڑھ کے آئندہ مسلک، اسٹاف کے رویے پر تقریر کی۔ سب نے بڑے غور سے سنا اور اس طور پر گویا پورے طور پر ان سے اتفاق کرتے ہیں اس کے بعد جو کچھ گذری وہ رشید صاحب کے الفاظ میں دیکھیے:

" اتنے میں ایک اور صاحب آ گئے۔ جان پہچان کے ہیں اور نام لے لوں تو آپ پہچان جائیں گے۔ انھوں نے سنا تو لال بھبوکا ہو گئے اور بہت کچھ چیخ کر اور سارے آداب شرافت کو بالائے طاق رکھ کر بولے " یہ بات اور باتیں ہم سے پوچھے بغیر یاں کیوں کرلی گئیں " سارے لوگ متحیر رہ گئے اور بعضوں نے سنجیدگی سے سمجھانا شروع کر دیا، لیکن یہ خاکسار اور اس کی لیڈری ختم ہو گئی تلوے سے آگ اٹھی اور سر کے بیچوں بیچ سے نکل کر زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ لپک کر ان کی گردن دونوں پنجوں سے اس طرح دباؤں کہ ان کا دم میری گرفت کی فشار سے اور میرا دم غیظ و غضب اور ہائی بلڈ پریشر سے نکل جائے لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ اپنی لیڈری کو ہزاروں لعنتوں کے ساتھ دفن کر کے چلا آیا "

اس کے بعد رشید صاحب نے ایک خاں صاحب کا لطیفہ لکھا ہے جو فاقے سے مجبور ہو کر گھر سے بھیک مانگنے نکلے کچھ دور چل کر واپس آئے، بیوی سے کہا ذرا کھونٹی سے تلوار اتار کر دے دینا۔ بیوی نے پوچھا، بھیک تو مانگنے نکلے ہو تلوار لے کر کیا کرو گے، بولے اور کہیں حجت ہو گئی تو کیا تلوار لینے گھر آؤں گا " یہ قصہ بیان کرنے کے بعد رشید صاحب فرماتے ہیں کہ:

" اگر بھیک مانگنے میں تلوار ضروری ہے تو لیڈری میں بھی از بس ضروری ہے تلوار نہ سہی، جوتا سہی "

نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے وائس چانسلر ہونے کے کچھ دن بعد مسز نائیڈو علی گڑھ گئی تھیں۔ اس سلسلے میں ۱۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کل گورنر صاحبہ تشریف لائیں۔ سارے مراحل بہ خوش اسلوبی انجام کو پہنچے۔ اسٹریچی ہال میں بھی، یونین میں بھی۔۔۔۔ اسٹریچی ہال اور یونین دونوں میں بڑی بے نظیر تقریر کی۔ ہاں آپ کو بھی سن کر تعجب ہوگا کہ وہ مجھے پہچان گئیں۔"

اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ایک بات آپ بھی عجیب محسوس کریں گے یعنی یہاں ہم سب اس خوش دلی اور آزادی سے گورنر سے ملے اور انھوں نے ہماری پذیرائی کی جو میں پچھلے سالوں اور تو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے حضور میں نہ دیکھ سکا تھا۔۔۔۔ حاذق صاحب نے حسبِ معمول قصیدہ پڑھا اور ہادی صاحب نے کرتب دکھائے۔ میں نے یہ کیا کہ موصوفہ کی ایک نظم کو مسعود اور اختر انصاری کی معرفت تین اسالیب میں منتقل کرایا اور وائس چانسلر کے ڈنر کے بعد موصوفہ کو ان لوگوں سے سنوایا۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس کارڈ پر آپ عطرِ حنا کا جو دھبہ دیکھتے ہیں اسے صرف میری بے شعوری پر محمول کیجئے گا۔ اپنے لاشعور کو نہ دخل دیجئے گا۔ اس میں میرے لاشعور کو صرف اتنا دخل ہے کہ کہیں اور بھیجتا تو لوگ بے تمیزی سمجھتے اسی لیے مناسب سمجھا کہ آپ کے یہاں بھیج دوں۔ اس سلسلے میں منّی کا ایک لطیفہ سنئے۔ جب یہ بہت چھوٹی تھی اور آپا جان ہمارے یہاں رہتی تھیں تو ایک دن وہ مٹھائی کا چھوٹا سا ٹکڑا آپا جان کے پاس لائی کہ اسے کھا لیجئے۔ آپا جان نے اسے گلے سے لگایا اور اس کی محبت کی داد دی، تو منّی نے کہا کہ میں نے اسے نہیں کھایا اس لئے کہ یہ زمین پر گر گیا تھا۔"

ترقی پسندی کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ ترقی پسند جب غالب کو اپنا لیں تو مجھ کو ترقی پسند ہونے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ جیسے جناح صاحب نے جامعہ کی جوبلی میں شرکت کر لی تو مجھے ہمیشہ باوضو رہنا چاہیئے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ترقی پسندی فن اور شرافت میں بالضرور موجود ہوتی ہے بلکہ فن اور شرافت ترقی پسندی سے عبارت ہی ہے مستثنیات سے قطع نظر یہ جماعت جسے ترقی پسند کہتے ہیں PRIMITIVE INSTINCTS کے ابھرنے اور اس کو اپنے آپ میں (دوسروں میں نہیں) پنپنے دینے اور اس سے تھوڑی دیر کے لیے لذت اندوز ہونے کے مواقع ملنے کو ترقی پسندی کہتے ہیں جس طرح آج کل کے بے ہودے اسلام کا نام لے کر اپنی بے ہودگیوں کی مکافات سے بچنے کی طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ اسلام کا نام لیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ ہر طرح کی غیر اسلامی حرکتوں پر پردہ پڑا رہے یا اس کی مدافعت ہوتی رہے۔ اسی لیے تو بعض دفعہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔ کیا ہوا اگر اس سلسلے میں مجھے غالب سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ آپ کو تو اس سے انکار نہ ہوگا کہ مجھے اچھی چیز اور بڑی بات ہمیشہ پسند آتی ہے۔ ترقی پسندی اور کسے کہتے ہیں؟"

اس کے بعد اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں:

"غالب کی عظمت ترقی پسندوں کے ریزولیشن کی محتاج نہیں ہے۔ عظمت کسی لیبل کی محتاج نہیں ہوتی، لیبل خود عظمت کا محتاج ہوتا ہے۔ اشعار کی صوفیانہ تعبیر سے اشعار کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر تعبیر کرنے والے کی ذہنی الجھن اور بے مائگی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے انیسویں صدی کے آخر میں سید امیر علی اور اس قبیل کے بعض اور لکھنے والے یورپ کی تمدنی خرابیوں میں (جو اس وقت بڑی محکم اور برگزیدہ سمجھی جاتی تھیں) اسلام کی برکتیں ڈھونڈ نکالتے تھے۔ غالب کو اپنانے میں ترقی پسند جماعت کی ذہنیت بھی اسی قسم کی ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کے لکھ جانے سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں ترقی پسندوں سے خار کھائے بیٹھا ہوں اور ان کے نام سے چڑھتا ہوں۔ اس طرح کی حرکت صرف مولوی کر سکتا ہے جو ترقی پسندوں سے بھی گیا گذرا ہے۔ ترقی پسندوں کو غالب کے قریب جاتے دیکھئے۔ یہ آثار امید افزا ہیں کیا تعجب غالب کی برگزیدگی ان کو بھی برگزیدہ بنا دے۔ اور وہ دن یقیناً بڑا مبارک دن ہوگا۔"

جگر صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سرور صاحب۔ جگر صاحب کے بارے میں ہم آپ دونوں متفق ہیں۔ اپنے اپنے اعترافات کا انداز مختلف۔ جگر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کو آپ اجاگر کیجیے نتیجہ وہی نکلے گا جو میں کہتا آیا ہوں۔ ذات صفات سے پہچانی جاتی ہے لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ذات میں صفت ہوتی ہے۔ شخص ہمیشہ شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔ شاعرانہ شخصیت جز ہے کل نہیں۔"

مگر ان باتوں میں کچھ نہیں دھرا۔ دھرا اس میں ہے جو آپ لکھیں گے وہ دیکھوں گا تو کہوں گا جگر صاحب اور ان کا کلام تو رہے علیحدہ خود آپ کہاں ہیں؟"

علی گڑھ سے رشید صاحب کو عشق تھا۔ اگر کسی حلقے سے اس کے خلاف کوئی پروپگنڈا ہوتا تھا تو ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کے خلاف جو پروپگنڈہ ہو رہا ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ قومی آواز کے لیے ایک مضمون بھی لکھ چکا تھا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ مجھے قومی آواز کا انداز پسند نہیں ہے۔ اُردو اخبارات کا ٹون ہمیشہ گرا ہوا ہوتا ہے۔ حیات اللہ انصاری سے ایک طرح کی وابستگی ہے اس لیے اُن سے یا اُن کے اخبار سے اس طرح کی حرکت سرزد ہوتی ہے تو طبیعت بدحظ ہوتی ہے۔ سرور صاحب! حیدرآباد، پاکستان، علی گڑھ کا رونا نہیں ہے مسلمانوں کا رونا ہے ان کی عقل ماری گئی ہے جہاں ہیں وہاں رسوا ہیں۔ بڑی قوم بگڑتی ہے تو اس طرح بگڑتی ہے کہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ محض اسی لیے کہ وہ جانتی ہی نہیں کہ وہ بگڑ چکی ہے۔"

مسز نائیڈو کی وفات کا رشید صاحب پر بہت اثر تھا۔ اپنے ۲۶ مارچ ۱۹۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے خوب معلوم ہے مسز نائیڈو مرحومہ کی وفات کا آپ پر کیسا اثر ہوگا۔ جے پور اور حیدرآباد میں وہ کس شفقت سے ملی تھیں۔ اس عورت کے دل میں شریفوں کے لیے کیسی محبت اور گرمی تھی۔ اِدھر یہ بات اکثر ذہن میں آتی تھی کہ یہ گورنری سے سبکدوش ہوں تو ان کے اور قریب ہو جاؤں اور ان کی کوئی خدمت کروں، یہ ہوتیں، ذاکر صاحب ہوتے، سرسپرو ہوتے، آپ ہوتے ان سب کا خیال آتا ہے تو شعر و ادب کا ذوق کیسا شریفانہ اور مہتم بالشان معلوم ہوتا ہے جیسے کہ میں کبھی بُرا نہیں رہا۔"

اسی خط میں انھوں نے کیمونسٹوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مجھے یہ کیمونسٹ کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔ ممکن ہے میں کسی اچھے کیمونسٹ سے واقف نہ ہوں۔ میں ان کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا۔ یہ عام حکم لگانا بھی کوئی معقول بات نہیں ہے لیکن کیا کروں جن دو ایک کو میں جانتا ہوں وہ تو بقول بمبئی والوں کے بڑے "دوکھرا" ہیں۔"

اسی خط میں لکھتے ہیں:

"حیات اللہ انصاری کے بارے میں مجھے ہمیشہ شبہ اور تردّد رہا۔ ان کو صرف رسوا کرنے میں لطف آتا ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ ذہنیت ہے۔"

اکثر چلتے چلاتے مجھ پر چھینٹے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۰رجون ۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اب تک آپ کے دوست دشمن آپ کی فتوحات دکن سنتے سنتے آپ کی جان کے لاگو بن چکے ہوں گے۔ میں ان باتوں کو یوں معاف کر دیتا ہوں کہ آپ نے کبھی مراحی کے بھرنے میں جس شوق نہیں شرافت کا ثبوت دیا ہے اس سے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا لعنت اللہ علی الماجدین۔"

مجھ سے انھوں نے ذاکر صاحب پر کچھ نوٹس مانگے تھے جن کے بھیجنے میں دیر ہوئی جن صاحبہ کو یہ نوٹ مطلوب تھے ان کا نام مس اسٹروپ تھا۔ ۱۴رجولائی ۴۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آج میں نے ان کو بڑی لجاجت کا خط لکھا ہے کہ میرے ایک مہربان ہیں جو ضیاءاللہ نیت کر رہے ہیں اور کیا کرتا۔"

عابد صاحب کی علالت کی وجہ سے ان کے اخبار نئی روشنی میں چار مزاحیہ کالم رشید صاحب نے لکھے تھے۔ میں نے ان کے اسلوب کو پہچان کر ایک خط میں اس طرف اشارہ کیا تو انھوں نے لکھا:

"آپ نے خوب سمجھا گیوا کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے۔"

گیوا آوارہ کا ایک کردار تھا۔ آوارہ کے کئی مضامین رشید صاحب نے سہیل میں شائع کیے تھے آوارہ کے وہ خاصے معترف تھے آوارہ سید آل عبا مارہروی کا قلمی نام تھا ان کا انتقال تقریباً سو سال کی عمر میں چند سال ہوئے ہوا۔

میں نے ایک خط میں ابنائے وطن کا ماتم کیا تھا۔ رشید صاحب نے اس سلسلے میں ۱۲ اگست ۵۰ء کے اپنے ایک خط میں لکھا:

"ابنائے وطن کا آپ نے ماتم کیا ہے اور ٹھیک کیا ہے لیکن ایک بات یاد رکھیے جب تک ہم خود کچھ نہ ہوں گے کوئی دوسرا بات تک نہ پوچھے گا دور کیوں جائیے نکمّے کو ماں باپ، بیوی بچے، رشتے دار، احباب سب نکمّا ہی سمجھتے ہیں۔ مسلمان مدتوں سے ماتم پر جیے ہیں، جہاں ماتم نے کام نہ دیا وہاں شہدپن پر اتر آئے۔ ماتم نے اپنوں کا دل نرم کیا اور شہدپن سے اغیار سراسیمہ ہوئے اور کام بن گیا، اسی لیے تو میں اب اور زیادہ سراسیمہ ہوں کہ مسلمان جس آزمائش میں ہیں اس سے وہ عہدہ برآ ہو سکیں گے یا نہیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"زبان کا معاملہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑے گا اور ہندوؤں یا حکومت سے منت سماجت یا مار دھاڑ سے کوئی مفید صورت برآمد نہ ہو گی۔ شکوہ شکایت کا کوئی نتیجہ نہیں۔ اب قوم سے اور صرف ہم سے جو کچھ بن پڑے کرنا چاہیے۔ اخبار، رسائل انجمن کانفرنس مطبوعات، مشاعرے غرض ہر طرح کی سرگرمیاں اپنے بل بوتے پر ہونا چاہیے، اس کے لئے ہم میں سے ہر چھوٹے بڑے کو کچھ وقت دینا پڑے گا اور کچھ پیسے تھوڑی سی ترمیم کر لی جائے تو کام بن جائے گا۔ پانی ہرگز سر سے نہیں گذرا ہے تاوقتیکہ ہم خود سر نہوڑاتے جائیں، پھر ٹخنوں تک بھی پانی ہو تو ہم اپنے آپ کو ڈبو لیں گے۔"

۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند کا ایک وفد ذاکر صاحب کی قیادت میں سری سمپورنانند وزیر تعلیم اُتر پردیش سے ملا تھا۔ ان کی بد دماغی اور ذاکر صاحب تک کو نظر انداز کرنے پر میں نے رشید صاحب کو ایک بہت مفصل خط لکھا تھا۔ رشید صاحب نے خاصی تفصیل سے جواب دیا۔ ۲۸ رمئی ۱۹۵۱ء کے خط میں فرماتے ہیں:

"سرور صاحب آپ یقین مانیں کہ جس ہندو قوم میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال رہے ہوں وہ قوم سمپورنانندوں سے جلد داغدار نہیں ہو سکتی۔ سرور صاحب! آپ مجھے سمپورنانندوں اور عبدالماجدوں میں نہ پھنسایئے۔ مجھے تو خدا کے سامنے گاندھی جی سے آنکھ ملانے کی تیاری میں مبتلا رہنے دیجیے۔ گاندھی جی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں۔ حشر کے دن جب خدا مجھے بلا کر کہے گا کہ تیری قوم کے لئے گاندھی نے میرے نام پر جان دے دی تو نے میرے نام پر گاندھی کی قوم کے لئے کیا کیا تو میں کیا کروں گا اور تف ہے اس ہندوستانی مسلمان

مسلمان پر جس سے خدا یہ سوال کرے گا۔"

اسی خط میں انھوں نے مولانا عبدالماجدؒ کے سلسلے میں ایک اور اہم بات کہی ہے:

"مولانا عبدالماجد سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی خدمت کر رہے ہیں
مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں کے خلاف اور ہندوؤں کے دل میں مسلمان کے خلاف
کینہ پیدا کرانا یا اس کی پرورش کرنا ادبی بدکرداری کے علاوہ بڑی ادنیٰ درجہ کی خود پرستی ہے۔"

رشید صاحب شروع میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے پرجوش حامیوں میں تھے بعد میں کچھ اختلاف ہو گیا تھا
ڈاکٹر صاحب نے نظام حیدرآباد کے علی گڑھ آنے کے موقع پر رشید صاحب سے ایک سپاس نامہ تیار کرایا تھا۔
وہ سپاس نامہ ڈاکٹر صاحب کے بعض حواریوں کے کہنے پر کئی دفعہ بدلا گیا۔ ظاہر ہے کہ رشید صاحب کو یہ
بات اچھی نہ لگی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنی ترنگ میں یہ کہہ دیا کہ شعبۂ اردو ایک ایڈریس بھی تیار نہیں کر سکتا تو
اور کیا کر سکتا ہے۔ اس پر رشید صاحب اور آزردہ ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب سے کھنچ گئے تھے ۱۷؍ ستمبر
۵۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"یکم کو عید کی نماز پڑھنے کو مسجد میں گیا۔ واپسی میں معلوم نہیں کیوں اور کیسے ڈاکٹر ضیاء الدین
کے مزار پر ٹھہر گیا اور بے اختیار فاتحہ پڑھنے کا جی چاہا۔ کتنی باتیں دل میں آئیں اور
گذر گئیں، دل بھر آیا۔ میرا تو خیال ہے کہ غیب کے رجسٹر میں میرے ان کے کھاتے میں
اندراجات ضرور کئے ہوں گے۔"

آزادی کے بعد ہندی کے کچھ حامیوں میں عجیب بد دماغی اور فرعونیت آگئی تھی۔ ہندوستانی اکیڈمی کو
ہندی اکیڈمی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸؍ مئی ۵۳ء کو ہندوستانی اکیڈمی کی میٹنگ میں جو
منظر دیکھنے کو آیا اس سے رشید صاحب خاصے محظوظ ہوئے۔ ۱۱؍ جون ۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"تنگ نظری اور دل آزاری کا جو مظاہرہ کیا گیا اس سے مجھے بڑی تفریح ہوئی بالخصوص
پریسیڈنٹ کی گفتگو اور طریقہ کار سے یہ غریب تعداد، تمرد اور تمول کو سب کچھ سمجھتے
ہیں، یہی حال رہا تو اپنی تو تاریخ دہرائیں گے ہماری تاریخ کا کیا بگاڑ سکیں گے۔"

میں نے ضیائے حیات پر (ڈاکٹر ضیاء الدین کی سوانح عمری امین زبیری کے قلم سے) اردو ادب میں ریویو
کیا تھا۔ رشید صاحب کو یہ ریویو پسند نہ آیا۔ ان کی رائے بہت دلچسپ تھی۔ رشید صاحب اس کے
قائل تھے کہ مرحومین کی خامیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا
بھی ذکر آنا چاہیے۔ تاکہ پڑھنے والے کے سامنے تصویر کے دونوں رخ آسکیں اور وہ بحیثیت مجموعی رائے

دے سکے۔ انھوں نے، ۱۱ اکتوبر ۵۳ء کے خط میں لکھا تھا کہ:

"پڑھنے والے پر یہ اثر ہوتا ہے کہ ریویو لکھنے والے کو ڈاکٹر ضیاء الدین سے عناد بھی ہے آپ نے حسب معمول تمام باتیں بڑی ترتیب و تفصیل سے بیان کی ہیں اور جو کچھ کہا ہے وہ بے کم و کاست صحیح ہے کہیں پر کوئی سخیف یا کوئی رکیک جملہ قلم سے نہیں نکلا ہے لیکن جس دھن میں اور جس بر ہمیزاری (بے زاری) سے آپ نے کام لیا ہے وہ آپ کے پائے سے قدرے پنچی ہے ۔۔۔ لیکن اس سے قطع نظر آپ نے جو باتیں لکھ دی ہیں وہ ضیائے حیات کو ہمیشہ ہمیشہ بے نور کر دینے کو کافی ہیں۔ مجھے یہ بات یوں کھٹکی کہ میں اپنے بدترین دشمن کو بھی اس کے مرجانے کے بعد معاف کر دینے کے لئے آمادہ رہتا ہوں۔ آپ سے کہیں زیادہ میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے جور سہے ہیں لیکن اب میں نہیں چاہتا کہ ان کا تذکرہ بُرے الفاظ میں کیا جائے۔"

اس خط سے رشید صاحب کی شرقیت اور قدیم روایات کی پاسداری کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر مشہور سائنسداں، کسٹری کے مانے ہوئے اکسپرٹ اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ یہ غالب کے شاگرد ہرگوپال تفتہ کے خاندان سے تھے۔ رشید صاحب کے داماد خورشید منیر کو ملازمت بھی انھوں نے ہی دلائی تھی اور وہ رشید صاحب کی لڑکی اور داماد دونوں سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ رشید صاحب کی لڑکی سلمیٰ کی روایت یہ ہے کہ "ڈاکٹر انجکشن دے رہے تھے اور یہ اردو کا حسب حال شعر پڑھ رہے تھے کہ روح پرواز کر گئی"۔ رشید صاحب پر ان کے انتقال کا بہت اثر تھا۔

میں رشید صاحب کے ادبی نقطہ نظر کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کو چھیڑتا رہتا تھا تاکہ وہ مشتعل ہو کر اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہیں، کبھی وہ گول کر جاتے اور کبھی برس پڑتے۔ ۲ مئی ۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے کچھ اور باتیں لکھنے کے بعد یہ فقرہ لکھا ہے۔ آپ (یعنی میں) خالص ادب کے پرستار ہیں میں (یعنی آپ) ادب برائے زندگی کے ۔۔۔ آپ نے مجھے غلام امام شہید یا نوح ناروی کیوں سمجھ لیا ہے۔ ادب برائے زندگی ترقی پسندوں کے نزدیک دو حقیقتیں ہوں گی۔ پیغمبروں کے یہاں ایک ہی چیز ہے۔ آپ میری پیغمبری پر ہنس پڑیں گے، آپ کا ہنسنا ٹھیک ہے لیکن میں پیغمبر نہ ہونے پر بھی پیغمبری کا قائل ہوں"۔۔۔ سرور صاحب آپ جس چیز کو ادب برائے زندگی کہتے ہیں در اصل وہ زیادہ سے زیادہ ادب برائے تحریک

ہے۔ تحریک سے میرا مطلب مثلاً اشتراکیت ہے۔ آپ یقین مانیں ترقی پسندی کوئی ادبی یا متعلق بہ زندگی تحریک نہیں ہے۔ وہ تو زندگی کے ایک پہلو سے متعلق ہے خدا کے لئے آپ کبھی کبھی کسی سر پھرے کے اس شعر پر بھی غور کر لیا کیجئے ؎

دریا بہ وجود خویش موجے دارد
خس پنداشت کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہے تو دریا کے بجائے ادب رکھ لیجیے۔

ان خطوں میں یونیورسٹی کے بعض واقعات کی طرف بھی اشارے ہیں۔ ذاکر صاحب کی جانشین کی نامزدگی کا مسئلہ تھا ۱۲؍اگست ۵۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"کونسل کی میٹنگ ہوئی، ذاکر صاحب نے صدارت کی، زیدی صاحب کا نام اول، عبدالحق صاحب کا دوم، نوراللہ صاحب کا سوم اور پروفیسر حبیب الرحمٰن کا چہارم بھیجا گیا۔ بارے ہر چیز خوش اسلوبی سے طے ہوئی۔ ذاکر صاحب غالباً پندرہ کی صبح کو دہلی واپس جائیں گے۔"

کچھ لوگ اس غلط فہمی کے پھیلانے میں کہ میں رشید صاحب کا شاگرد ہوں بہت دلچسپی لے رہے تھے رشید صاحب نے اپنے ۹؍اگست ۵۷ء کے خط میں خود اس کی تردید کردی:

"آج کل ادھر اُدھر یہ غلط خبر ذرا زیادہ پھیلنے لگ گئی ہے کہ آپ میرے شاگرد ہیں!! اور لطف یہ ہے کہ جب آپ کو برا بتانا ہوتا ہے تو میری شاگردی کا واسطہ دیتے ہیں اور جب آپ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں۔ آپ کی شرافت ہے کہ آپ اس غلط فہمی کی تردید نہیں کرتے ہیں۔ اپنا بے غیرتی کو کیا کہوں کہ چپکا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے! چپکا میں چچ کو زیر بھی دے سکتے ہیں یاد رکھئے کبھی نہ کبھی کام آئے گا۔"

رشید صاحب بعض اوقات ایسی تجاویز پیش کرتے جو ان کے نزدیک یونیورسٹی کے مفاد میں ہوتیں فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کا انتقال ہوا تھا۔ رشید صاحب نے مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ وائس چانسلر سے کہہ کر ایک مناسب رقم کا مولانا آزاد مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے لئے یونیورسٹی کی طرف سے اعلان کر دیا جائے۔ میں نے وائس چانسلر تک یہ تجویز پہنچادی تھی۔ اب یہ یاد نہیں کہ اس سلسلے میں کیا کارروائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی رشید صاحب مجھے یونیورسٹی یا انجمن ترقی اُردو کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی مشورہ دیتے رہتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مرکزی حکومت نے لسانی اقلیتوں کے متعلق کچھ سہولتوں کا اعلان کیا تھا۔ رشید صاحب چاہتے تھے کہ "ایک گشتی مراسلہ تمام شاخوں کے نام جائے کہ وہ مرکزی حکومت کے حالیہ

اعلان پر شکریہ کا ریزولیوشن پاس کریں. ہماری زبان میں دو ایک کالم خطوط کے لئے وقف کئے جائیں ایسے شعرا کا کلام خاص طور پر حاصل کر کے شائع کیا جائے جو ہندوستان کے دور دراز ترین گوشوں میں بستے ہوں، نیز غیر مسلم شعرار کا کلام پہلی اشاعت یا دوسری تیسری اشاعت میں باالتزام شائع کیا جائے. کبھی کبھی یہ بحث بھی ہو کہ بعض عام الفاظ کا غلط تلفظ یا املا جوں کا توں رہنے دیا جائے یا اس کو صحیح کر دیا جائے"۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ۱۹۵۸ء تک علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی اسکیم میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر پھر شعبۂ فارسی میں ریڈر ہو گئے. رشید صاحب چاہتے تھے کہ چونکہ پہلی جلد کی تیاری میں قریب قریب سارا کام نذیر صاحب کا تھا اس لئے اس جلد کی پریس کاپی تک تیار کرنے کے لئے نذیر صاحب کو سو روپے کا ماہوار الاؤنس دیا جائے. تجویز بہت اچھی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا. افسوس کہ جب پہلی جلد شائع ہوئی تو اس میں طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔

رشید صاحب کی یہ عادت تھی کہ جن لوگوں کو وہ عزیز رکھتے تھے اور جن پر ان کو پورا اعتماد تھا ان سے اکثر یہ کہتے تھے کہ ان کے کسی مضمون کو دیکھ لیں اور ان میں جہاں چاہے اصلاح کر دیں. دراصل اصلاح کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا تھا لیکن غالباً وہ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ جو کچھ وہ لکھتے تھے وہ توڑ کے وقت اور گویا کہ اِدھوں گھنٹے میں. اس لئے اس کا امکان باقی رہ جاتا تھا کہ کوئی چیز چھوٹ گئی ہو یا غیر ضروری طور پر آگئی ہو. علی گڑھ تحریک پر مقالات کا جو مجموعہ نسیم قریشی کی ادارت میں شائع ہونے والا تھا اس کے لئے انھوں نے جو مضمون لکھا تھا اس کے متعلق مجھے، نومبر ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"بہت ممکن ہے میں نے کسی کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو یا خود میرے خیالات "ناقابلِ التفات سطحی یا غلط ہوں، لکھنے کا انداز، لب و لہجہ نا مناسب ہو یا طوالت بیانی سے کام لیا گیا ہو وغیرہ. آپ کو کامل اختیار ہے جہاں جس قسم کی ترمیم یا کمی بیشی چاہیں کر دیں"۔

میں شروع سے یہ چاہتا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو بھی ذریعۂ تعلیم ہو یعنی موجودہ صورتِ حال جاری رہے جس میں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے لیکن اس کے علاوہ اُردو کو بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور کام کا آغاز پہلے آرٹس فیکلٹی سے کیا جائے. پھر سماجی علوم اور کامرس میں بھی ذریعۂ تعلیم اُردو ہو اور آخر میں سائنس میں. میں نے اس سلسلے میں اکیڈمک کونسل میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ یونیورسٹی ایک کمیٹی بنائے جو تمام پہلوؤں پر غور کر کے اپنی رائے دے. کمیٹی کی میٹنگ کا نوٹس رشید صاحب کو بھی بھیجا گیا تھا. اس سلسلے میں ۱۲ / نومبر ۱۹۶۱ء کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری ناچیز رائے یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سال میں اُردو کا جیسا کچھ حال رہا ہے اور جس کے حسب دلخواہ طے پانے کا کوئی امکان بظاہر مدتوں نظر نہیں آتا. اُردو کو مسلم یونیورسٹی میں وسیلۂ تعلیم بنانے کا خیال ترک نہیں تو ملتوی رکھنا چاہیئے ورنہ خود اس ادارے کو نقصانِ عظیم پہنچنے کا اندیشہ ہے. اس وقت انگریزی تعلیم کا معیار زیادہ سے زیادہ اونچا رکھنے کی تدابیر پر عمل کرنا مناسب اور مفید ہوگا ۔ ۔ ۔ اگر کچھ لازمی مضامین حذف کر دیئے جائیں جب بھی کچھ ایسا مضائقہ نہیں ۔ ۔ ۔ یہ باتیں بظاہر نہایت رجعت پسندانہ معلوم ہوں گی لیکن موجودہ حالات میں ہم کو اُردو سے زیادہ مسلم یونیورسٹی کی خیریت و شہرت پر نظر رکھنا چاہیئے"

بہر حال جب کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو سائنس کے سب استادوں نے اور انگریزی کے سب استادوں نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور اس مسئلے پر مزید غور و خوض ملتوی کر دیا گیا. میں نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی وائس چانسلری کے زمانے میں یہ مسئلہ اٹھایا مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا. میں آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو انگریزی کے ساتھ اُردو ذریعۂ تعلیم کا تجربہ ضرور کرنا چاہیئے تھا. مجھے اندیشہ یہ ہے کہ ہم علی گڑھ میں انگریزی میڈیم کو پندرہ بیس سال سے زیادہ نہ چلا سکیں گے اور بالآخر شاید یہاں بھی ہندی میڈیم ہی اختیار کر لی جائے. پھر علی گڑھ کے مخصوص کردار کا کیا ہوگا.

رشید صاحب جامعۂ اُردو کے سلسلے میں برابر مجھ سے مشورہ کرتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ ۶۲ء، ۷۳ء تک چلا. ۷۲ء کے اکتوبر میں، میں یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا اور اپریل کے شروع میں وزیٹنگ فیلو ہو کر شملہ چلا گیا. رشید صاحب کو ۷۱ء کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تھا. سب سے پہلے میں نے ہی جا کر انھیں اس کی خبر دی تھی. اس ایوارڈ کی تہنیت پر شعبۂ اُردو نے بھی ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا. وہ آنے کو تیار تھے. انھوں نے اس کے لئے اپنا خطبہ بھی لکھ لیا تھا لیکن پھر علالت کی وجہ سے نہ آ سکے. انھوں نے جو خطبہ لکھا تھا وہ مجھے بھیج دیا تھا جیسا کہ ان کے ۱۰ مارچ ۷۲ء کے خط سے ظاہر ہوتا ہے. مگر بعد میں انھوں نے اپنا مسودہ واپس منگوا لیا اور تقریب بھی بالآخر نہ ہو سکی. ۲۴ فروری ۷۳ء کو بالآخر علیم صاحب کے دولت کدے پر رشید صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی انعام دیا گیا. علیم صاحب نے صدارت کی، میں نے CITATION پڑھا. ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری پربھاکر ماچوے، مالک رام، مختارالدین احمد اور دو ایک حضرات اور موجود تھے. اس تقریب کے

شروع ہونے سے پہلے مالک رام نے اچانک رشید صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ کی پیدائش ۱۸۹۲ء کی ہے یا ۱۸۹۴ء کی۔ رشید صاحب نے جواب دیا ۱۸۹۲ء کی۔ مجھے اس پر تعجب ہوا اس لئے کہ میں ۱۸۹۴ء سمجھتا تھا۔ غالباً مالک رام صاحب نے اپنے طور پر پہلے ہی تحقیق کرلی تھی مگر رشید صاحب سے وہ اس کی تصدیق چاہتے تھے جو انھوں نے کردی۔

میں نے شروع میں خطوط کے متعلق رشید صاحب کا اپنا نقطۂ نظر واضح کردیا تھا۔ ان خطوط کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جائے گی کہ یہ مجموعہ نہ صرف رشید صاحب کے بہترین خطوط کا مجموعہ ہے بلکہ اردو سرمائے میں بھی مکاتیب ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اب تک رشید صاحب کے خطوط کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں شاید یہی سرفہرست ٹھہرے۔ میری نظر سے ادیبوں کے جو خطوط گذرے ہیں ان میں غالب کے مکاتیب کے بعد خطوط کا یہ مجموعہ ایسی قدر و قیمت رکھتا ہے جسے وقت کبھی ماند نہ کرسکے گا۔ اس سلسلے میں رشید صاحب کے ان خطوط کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی اور پطرس بخاری کے خطوط کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔

ضمیمے کے پانچ خطوں کو شامل کرکے اس مجموعے میں خطوں کی کل تعداد ۲۱۶ ہو جاتی ہے۔

برک نے ڈاکٹر جانسن کا ایک تقریب میں تعارف کراتے ہوئے کہا تھا:

I AM PROUD TO HAVE RUNG THE BELL FOR DR. JOHNSON

(میں ڈاکٹر جانسن کے نام کا اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں) رشید صاحب کے خطوں کے اس مجموعے کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔

سرسید نگر
۲۵ر جولائی ۱۹۹۵ء

آل احمد سرور

مکتوباتِ نیاز پر اظہار خیال

مصنفہ - نیاز فتح پوری

میرے نزدیک سب سے دلچسپ اور مستند خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دیئے جائیں یا منظر عام پر نہ آئیں۔ اس لیے بذاتہ میں ایسے خطوط کا قائل نہیں ہوں جو شائع کیے جائیں چہ جائیکہ ان پر مقدمہ لکھا جائے اور ان کی تشریح و تحلیل کی جائے۔ اس اعتبار سے نیاز صاحب اور میں دونوں قصوروار ہیں، لیکن اکثر یہی چیز پبلک کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ گو میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب یا میں خودکشی کرلوں یا ان میں سے کوئی سنگسار کیا جائے تو پبلک کی دلچسپی کئی گنا بڑھ جائے گی!

خطوط بالعموم ایسے لوگوں کے محفوظ رکھے جاتے ہیں یا ان کو شائع کیا جاتا ہے جو پبلک کی نظروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے اہم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ایسے لوگ جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی حیثیت سے اہم سمجھتے ہیں، کبھی بے تکلف بے محابا یا بے جھجک ہونا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے ایسے لوگ بھی ہوں جو اپنی اہمیت کو اکثر بھول جایا کرتے ہوں، لیکن وہ کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ لوگ بھی انہیں بھول جایا کریں۔ چنانچہ ایسے لوگ جب کبھی اپنے خیالات سپردِ قلم کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ غیر شعوری طور پر بھی اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی چیز قلم سے ایسی نہ برآمد ہونی چاہیے جس پر ادبی، اخلاقی یا کسی اور نوعیت سے حرف گیری کی جاسکے اور یہی وہ احتیاط ہے جو خطوط کی ساری دلکشی یا اہمیت غارت کر دیتی ہے۔ خطوط نویسی ہی ایسا ''فن'' ہے جس کی تعمیر میں اصل معنوں میں ''مضمر ہے اک صورت خرابی کی''۔

خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

خط اور دوسرے قسم کے مضامین لکھنے والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے اس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے اور براہِ راست نوکِ قلم سے برآمد ہو جاتی ہے۔ دوسرے

لوگ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی تحریر منظر عام پر آئے گی اس کے حسن و قبح یا عواقب پر ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑیں گے اس لیے وہ دلی ولولوں کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا اور جو کچھ لکھتا ہے اس کو دماغ کے جنتر سے نکالتا ہے اور دل کو "پاسبانِ عقل" کی معیت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ دُنیا کی مستقل تصانیف کا یہی حال ہے اس لیے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا گھاگیت سے لبریز ہوتی ہیں یعنی جھوٹے سچ اور سچے جھوٹ کا ایک منظم پشتارہ!

خطوط کا میں احترام کرتا ہوں اس لیے کہ اصلی خطوط اس قسم کی بے عنوانیوں سے مبرّہ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بالعموم لوگ اپنی تصانیف کو شائع کرنا اور خطوط کا پرائیویٹ رکھنا یا چاک کر ڈالنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تصانیف پیشہ کی اور خطوط شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی اصلی سیرت یا شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کی جرأت ہو۔

داعیِ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظر عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھیئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جز و فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے! اس محکِ آتشیں پر آزمائے جانے پر کون آمادہ ہے؟

خطوط، لکھنے والے کی سیرت کے اصلی خط و خال ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ بے لاگ لکھے گئے ہوں اور اگر بے لاگ نہیں لکھے گئے ہیں تو ان سے زیادہ بے کارِ محض کوئی اور چیز نہیں کیونکہ ان پر خط کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا اور یہ چیز محض مضمون آفرینی یا مضمون نویسی ہوتی ہے جس کا کسی حد تک قابلِ برداشت نمونہ شعر و شاعری ہے۔ انسان کی اصلی سیرت کی غمازی اکثر دو چیزیں کرتی ہیں یعنی وہ موجود ہو تو اس کے ساتھ کھلیئے وہ کھل جائے گا اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط دیکھیئے وہ پکڑا جائے گا۔

میں اکثر اپنے طلبہ سے کہا کرتا ہوں کہ زندگی کی جنگ میں ممکن ہے مخلص نہ ہونا فائدہ بخش بھی ہو، لیکن انشا پردازی میں مخلص نہ ہونا مہلک ہے، لکھو جو تم محسوس کرتے ہو نہ یہ کہ دوسروں نے کیا محسوس کیا ہے یا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اگر ہر انسان اپنے حلیہ، سیرت اور تشخصات کے

اعتبار سے منفرد ہے تو بحیثیتِ انشاپرداز کیوں نہ منفرد ہو۔ تم اپنے والدین کو خط لکھتے ہو تو وہ فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ انشا اور املا سب کچھ تمہارا ہے اور صرف تمہارا ہے اور مضمون لکھتے ہو تو والدین تو کیا تم بھی نہیں بتا سکتے کہ تمہارا ہی لکھا ہوا ہے!

زمانہ کے تغیرات نے خطوط نویسی کے بھی اُسلوب بدل دیئے ہیں۔ پہلے مدتوں بعد خطوط کے بھیجنے کا سامان ہوتا تھا، عرصہ تک لکھے جاتے تھے اور ایک طویل زمانہ کے بعد پہنچتے تھے، خطوط اطمینان سے لکھے جاتے تھے اور شوق سے لکھے جاتے تھے اس لیے ان میں دلکشی ہوتی تھی، موثر ہوتے تھے اور یادگار کے طور پر محفوظ کر لیے جاتے تھے۔ اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ پہلے ضرورت ایجاد کی محرک ہوتی تھی، اب ایجاد ضرورتوں کی محرک ہوتی ہے۔ ایجادات نے زندگی کے اُسلوب بدل دیئے، بعضوں کا خیال ہے کہ اگر انسان کی مشغولیت اور بدحواسی کا یہی عالم رہا تو آئندہ خطوط صرف زبانی کھیل رہ جائے گا، لیکن مایوس ہونے کی وجہ نہیں ہے۔ جس طرح اور جن اسباب کے ماتحت طویل قصص یا ناولوں کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی، مجھے یقین ہے خطوط کی نوعیت بھی بدل جائے گی، فرصت کم ہونے کی سبب سے ممکن ہے آئندہ لوگ اپنے تمام خیالات خطوط ہی میں ادا کرنے لگیں۔ اب تک مکتوب کو نصف ملاقات کہتے آئے ہیں، ٹیلی ویژن (۱) کی ترقی سے ممکن ہے نصف ملاقات ''نصف بہتر'' قسم کی ملاقات پر ختم ہوا کرے اور تماشا کی کامیابی تمنا کی بے قراری کو بہت کچھ کم کر دیا کرے۔

خط نویسی کی تاریخ نہایت طول طویل اور دلچسپ ہے۔ یونانی ادب میں خط کا تذکرہ ہومر کی ایلیڈ میں آیا ہے۔ اس کی ابتدا یقیناً بعض مخصوص نشانات سے ہوئی ہوگی، اور اس زمانہ میں عوام اس سے اسی طور پر متحیر یا سراسیمہ ہوئے ہوں گے جیسے آج کل کے بعض وحشی قبائل گراموفون وغیرہ قسم کی چیزوں سے ہو سکتے ہیں۔ اہالیانِ روم میں یہ چیز زیادہ منظم اور مقبول ہوئی، یہاں تک کہ صدی قبلِ مسیح میں سِسرو نے خط نویسی میں جو شہرت حاصل کی اس کے سامنے اب بھی لوگ سرِ عقیدت خم کرتے ہیں۔ سِسرو کے خطوط کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ متمدن طبقوں اور مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں صدیوں لاطینی کا دور دورہ رہا اور لاطینی میں سِسرو کے خطوط

(۱) ٹیلی فون میں آواز سنائی دیتی ہے شکل نہیں دکھائی دیتی۔ ٹیلی ویژن میں آواز کے ساتھ ساتھ شکل بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کو آلۂ صوت رساں و شکل نما بھی کہہ سکتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: ''دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم۔'' ٹیلی ویژن کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔

اُسلوبِ خط نویسی کے بہترین نمونہ ہیں۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک انگریزوں کی آپس میں لاطینی ہی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ ملٹن اور کرامویل کے عہد تک سائنس اور علم سیاست کی زبان بھی لاطینی رہی، چودھویں صدی تک نہ تو انگریزوں کی متحدہ قومیت کا احساس ہوا اور نہ مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی دربار پر فرانسیسی زبان کا تسلّط رہا۔ یہی نہیں بلکہ بچوں کو ابتدا ہی سے فرنچ بولنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور فرانسیسی جاننا عالی نسبی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ جنگِ صد سالہ کے بعد انگریزوں میں روحِ ملّت بیدار ہوئی اور انہوں نے اپنی مادری زبان کو قوم کی زبان قرار دیا۔ انگریزی زبان میں وال پول، چسٹر فیلڈ، کاؤپر، فٹز جیرلڈ، اسٹیونس، کیٹس اور کارلائل خطوط نویسی کے امام مانے جاتے ہیں۔

اُردو میں بھی خط نویسی کی تاریخ انہیں حالات سے ملتی جلتی ہے، ہندوستان میں مسلمان حکم رانوں کی زبان فارسی رہی اور گو مغلوں کے آخر دورِ حکومت میں اُردو رفتہ رفتہ برسرِ عروج آنے لگی تھی، لوگ عام طور پر اُردو بولنے لگے تھے، شعر و شاعری بھی کافی ترقی کر چکی تھی، لیکن فارسی کا تسلط ایک گونہ برقرار ہی رہا۔ دورِ حاضر میں ابھی کافی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے عہدِ طفولیت میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور فارسی اور عربی کا جاننا شرافت اور خوش ذوقی کی دلیل تھی۔

غالبؔ کو جہاں اور بہت سی باتوں میں نمایاں خصوصیات حاصل ہیں ایک یہ بھی ہے، اور کسی سے کم نہیں ہے کہ جس چیز کو انہوں نے اپنے لیے "ننگ" قرار دیا تھا اس میں ایسے "نقش ہائے رنگ رنگ" پیدا کیے جو آج بھی بے مثل ہیں اور خطوط نویسی کے جدید ترین اُصولِ تنقید پر صحیح اترتے ہیں۔ غالبؔ نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ خط نویسی کا اولین اور شاید بہترین معیار یہی ہے۔ غالبؔ کے خطوط کا سب سے زبردست راز یہ ہے کہ انہوں نے رقعات میں اپنی سیرت اور اپنے ماحول کی ادنیٰ جزئیات کو بھی اصلی رنگ میں بغیر کسی تصنع یا آمیزش کے پیش کیا ہے اور اس امر کی کہیں کوشش نہیں کی کہ وہ بہترین شاعر، مفکر یا معلّم کے رنگ میں نظر آئیں۔ ان کی ظرافت، بذلہ سنجی، بے تکلفی، وسیع المشربی، شاگردوں سے اُلفت، بڑوں اور بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں پر شفقت ہر جگہ نمایاں ہے، زمانہ نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انہوں نے زمانہ کو کس طور پر برتا اس کے بعض نہایت دلنشیں نمونے ملتے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی جس چیز نے ان رقعات کو لازوال بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا لکھنے والا غالب اور صرف غالبؔ ہو سکتا تھا!

غالب کے علاوہ اوروں کے مکاتیب بھی شائع ہوئے ہیں، مثلاً سرسیّد، محسن الملک، امیر، نذیر احمد، شبلی، اکبر وغیرہ وغیرہ ان میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ شبلی کے خطوط ہیں۔ جس چیز کو شبلی نے عطیہ فیضی کے نام کے خطوط میں چھپانے کی کوشش کی ہے اس کو بے نقاب کرنا یوں ضروری نہیں ہے، کہ خود نقاب نے جلوؤں کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے ہماری اُفتادِ طبع کچھ ایسی ہے، جس کے حسن یا قبح سے یہاں بحث نہیں ہے، کہ ہم ہر چیز کو اکثر کھینچ تان کر اس معیارِ اخلاق سے پرکھنا چاہتے ہیں جو اکثر نفسِ اخلاق سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا مخصوص تمدن اور ماحول سے، شبلی کے ان خطوط سے شبلی کے پرستاروں کو نگاہ نیچی کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ خطوط میرے نزدیک یوں قابلِ احترام ہیں کہ ان میں انسانی جبلّت اور شاعرانہ شرافت کو ایک دوسرے سے متوازن رکھا گیا ہے ان خطوط میں تصنّع اور تکلّف کم اور صداقتِ شعری پورے طور پر نمایاں ہے۔ ہر حقیقت حسین ہوتی ہے، لیکن اکثر حسین نظر نہیں آتی۔ اصلی شاعر صرف وہ ہے جو حقیقت کو حسن کا جامہ پہنا سکے۔ حسنِ حقیقت، حقیقتِ حسن سے زیادہ دل کش چیز ہے ایک کا بے نقاب کرنا شاعر کا کام ہے اور دوسرے کی تحلیل و تجزیہ فلسفیوں کی بدتوفیقی ہے!

سرسیّد، محسن الملک، نذیر احمد کے خطوط کو پرائیویٹ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ انہوں نے ان خطوط کو اپنی نج کی زندگی کا آئینہ دار نہیں بننے دیا ہے۔ اس لیے ان بزرگوں کے خطوط کو یہاں ہم وہ حیثیت نہیں دینا چاہتے، جس کو ہم نے شروع سے مدنظر رکھا ہے، اکبر کے خطوط میں یہ صفت ضرور ہے کہ ان میں وہ اکثر اپنے خاص رنگ اور مخصوص حال میں نظر آئے ہیں، لیکن یہ خطوط بالعموم اس زمانے کے ہیں جب اُن پر ''گہے خندہ اُو چو تیغِ اصیلے'' کے بجائے۔ ''گہے گریہ اُو چو ابرِ بہارے'' زیادہ صادق آتا ہے۔

اب نیاز صاحب کے مکتوبات کی باری آتی ہے۔ نیاز صاحب بڑے گھاگھ ہیں۔ پہلے ہی پیترے میں انہوں نے میرے ان تمام خطرات کا سدِّ باب کرنا چاہا ہے جن کا اظہار میں نے ان اوراق کے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔ نیاز صاحب سے میرے بڑے پرانے ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں۔ بہت زمانہ ہوا اسٹریچی ہال کے سامنے ملاقات ہوئی، میں ہال کے اندر تھا چپراسی نے کہا ایک صاحب بلاتے ہیں، میں نکلا تو نیاز صاحب نظر آئے۔ اس سے پہلے صرف غائبانہ تعارف تھا، اور معلوم ہوتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے مرعوب تھے، لیکن ملاقات کا فوری انجام یہ ہوا کہ دونوں کا ایک دوسرے پر سے رعب زائل ہو گیا جس کا دونوں کو اب تک افسوس ہے۔

دو تین سال بعد ایک شام کو جو باوجود اس کے کہ عورتوں کا مجمع تھا اور موسم اعتدال پر تھا، قطعاً قاتل نہ تھی، نورالرحمٰن صاحب کی معیت میں نیاز صاحب سے دوسری ملاقات نمائش میں ہوئی، طے یہ پایا کہ تھیٹر دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم تینوں تماشا گاہ پہنچے۔ جگہ کچھ ایسی ملی تھی کہ جہاں سوا مونگ پھلی کھانے کے اور کوئی موقع ہی نہ تھا، نیاز صاحب نے آرٹ کی کچھ فضا بھی پیدا کرنی چاہی، لیکن فوراً پردہ اُٹھنے کا اعلان ہوا، اور بادشاہ صاحب گاتے ہوئے نظر آئے۔ ہاتھ میں ابرک کا ایک رنگین گلاس، پاؤں میں روپ سول کا میلا سا جوتا! ابھی ہم سب سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بادشاہ صاحب نے ایک لمبے، بلند اور بھرپور سُر کے عین وسط میں اس زور سے گلا صاف کیا کہ ہم تینوں دہل گئے اور قریب تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کی زبان سے کوئی اضطراری فقرہ برآمد ہوتا کہ مردود نے سہیلیوں کے ساتھ چٹکی بجانی شروع کر دی اور ہم تینوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے!

یہ وہ زمانہ تھا جب نگار بھوپال سے نکلتا تھا اور نیاز صاحب کے ذہن و دماغ میں ''نگارستاں''(۱) کی کارفرمائی تھی خوب خوب چیزیں نکل رہی تھیں اور مجھے بڑی مسرّت تھی کہ اُردو میں ایک خوشگوار اُسلوب کی طرح پڑ رہی تھی۔ یلدرم نے جس چیز کو حسین اور دل کش بنا دیا تھا، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ بعض بعض چیزیں داغ کے رنگ سے گزر کر داغ کے ''دھبوں'' سے ضرور جا ملی تھیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی فضا میں رنگ یا آہنگ کا کہیں اختلال نہ تھا۔ اسی دوران میں آگرہ سے نقاد نکلا اور مجھے افسوس ہوا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ادبِ لطیف ادبی اوباشی کا مترادف بن جائے گا، ایسا ہی ہوا۔ شبابیات اور ٹیگوریت نے اُردو کی فضا ایسی مسموم اور متعفّن کر دی کہ مجھے رہ رہ کر اُردو کا وہ زمانہ یاد آنے لگا جس کو متعین کرنا آسان ہے، لیکن جس کے اظہار میں سراسر زیاں ہے۔ نیاز صاحب کی ہمّت ہو تو فٹ نوٹ میں میری ذمہ داری پر اس کا اظہار کر سکتے ہیں!

ادبِ لطیف جس کے امام یلدرم اور نیاز صاحب تھے بازاری لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہوا جو یقیناً کم مایہ، ناتجربہ کار اور نامعقول تھے اور جلد سے جلد کسی قیمت پر سستی سے سستی شہرت حاصل کرنے کے بھوکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نت نئے رسالے نکلنے لگے اور ان میں خرافات کو وہ فروغ دیا گیا کہ شریفوں پر دُنیا تنگ ہو گئی۔

یلدرم اپنی جگہ پر قائم رہے ان کو اپنی شاعرانہ پرواز کے لیے تُرکی ادب کی وسیع اور

---

(۱) نیاز صاحب کے افسانوں کا مجموعہ۔

صالح فضا پہلے سے میسر تھی، نیاز رقاصہ کی بزم تک پہنچ چکے تھے کہ ناگہ زکمیں

''عالم آشوب نگاہے سر راہم بہ گرفت''

نیاز صاحب لکھنؤ پہنچے اور لکھنؤ والوں سے ٹکر ہوئی۔ایک طرف نیاز صاحب تھے دوسری طرف لکھنؤ کا تمدن وہاں کی معاشرت، وہاں کے لوگ، وہاں کی روایات اور وہاں کی شعروشاعری۔ یہ حالات وحوادث بجائے خود کیا کم تھے اور نیاز صاحب میں کیا کچھ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے تھے کہ مولانا ماجد صاحب نے اسلام کو خطرہ میں پا کر مسلمانوں کو صف جہاد میں آجانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔مولانا ماجد صاحب فتح یاب رہے، نیاز صاحب کو زک ہوئی اور اسلام جہاں کا تہاں رہا!

ان واقعات سے نیاز صاحب کا ذہن ودماغ غیر شعوری طور پر متاثر ہوا۔اب ان کی تحریروں میں وہ شگفتگی، رنگینی اور ''جذبۂ بے اختیار شوق'' نہیں پایا جاتا جو ''نگارستاں'' کی جان ہے۔اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور سوسائٹی سے بے زار ہیں۔ان کی تحریروں میں بے زاری، زہرناکی اور انتقام کی لہریں ملتی ہیں اور یہ حقیقت حال بجائے خود اس درجہ روح فرسا ہے کہ اس سے پناہ لینے کی خاطر اُن کو شراب وشاہد جیسی سستی اور گریز پالذتوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔پناہ لینے کے معنے یہاں کام ودہن کی لذّت یابی نہیں بلکہ وہ ذہن کی زہرناکی کو کبھی شاہد وشراب کی حکایتِ لطیف سے تسکین دینا چاہتے ہیں اور کبھی زندگی کے بعض نازک، عمیق یا پیچیدہ مسائل سے تنگ وترش ہو کر نظامِ حیات ومعاشرت کو یکسر اس مشتبہ اخلاقیت کے ورطہ میں دھکیل دینا چاہتے ہیں جس کو عرف عام میں لامذہبی، التذاذیت یا اشتراکیت وغیرہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ذہنی میلان موجودہ دنیا کا سب سے بڑا انکشاف یا سرمایۂ ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مذہب اخلاق یا سوسائٹی کے دیرینہ تصور سے یکسر بغاوت کر دی جائے اور ہر کس (وناکس) سوچنے ہی پر آزادانہ ہو بلکہ اپنی سوچی ہوئی چیز کو قطعاً صحیح یا حق بجانب سمجھنے اور آزادی سے برتنے میں بھی آزاد ہو۔ہر شخص کو ہمیشہ سوچنے اور سمجھنے کی آزادی رہی ہے یہ نعمت کچھ آج ہی کی دریافت کی ہوئی نہیں ہے۔البتہ جو چیز آج کی ہے وہ یہ کہ ہر شخص جو کچھ سوچتا ہے وہ صحیح اور صالح بھی ہے اور دوسری چیزیں صحیح اور صالح اس لیے نہیں ہیں کہ وہ دوسرے کی سوچی اور برتی ہوئی ہیں!

اصل یہ ہے کہ مادّی ذرائع اور وسائل کی ترقّی سے آج کل زندگی اس درجہ تیز وتند ہو گئی ہے کہ ہم اس کا مداوا صرف مفرّحات یا محرّکات سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ

باقاعدہ علاج کی فرصت ہی باقی نہ رہی۔ اب زندگی عزیز نہیں رہی بلکہ زندگی کے لذائذ عزیز رہ گئے ہیں۔ امتحانات کا احترام نہیں ڈگریاں مقصود بالذات ہوگئیں!

نیاز صاحب میری اس فرسودہ منشی پر کیا کچھ چیں بہ جبیں نہ ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کجا مطربی و مسخرگی اور کجا یہ قل اعوذیت، لیکن کیا کیا جائے جب معلّم و مصلح مطربی و مسخرگی اختیار کرلے تو بے چارہ مُطرب و مسخرہ کیا کرے۔

نیاز صاحب سے میں یہ کہوں گا کہ بوڑھوں کو در گور سمجھئے، لیکن رزمِ حیات میں نوجوانوں کو صرف صف آراء اور سینہ سپر ہونے کی دعوت دیجئے۔ نوجوانوں کے سامنے بڑی بڑی گتھیاں ہیں جو ہمارے آپ کے آباؤاجداد کے سامنے بھی غالباً نہیں آئی تھیں۔ ان کو غیر ذمہ دارانہ فقرے یا شعر، شراب و شباب کی سرمستیوں کی طرف اشارہ کر کے اپنی ذمہ داری نہ بھولئے اور نہ ان نوجوانوں کو بوالہوسی یا سہل انگاری پر آمادہ ہونے دیجئے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی مسئلہ یا معاملہ پر خود متیقن نہیں ہوتے یا اس کا صحیح محل سمجھنے سے معذور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں طالب یا تشنہ کو غیر ذمہ دارانہ بشارتوں یا غفلت زا طرب انگیزیوں کی طرف متوجہ یا مائل کر دینا قطعاً غیر صالح فعل ہوتا ہے۔ اسی کو "عطائیت" کہتے ہیں۔ نوجوانوں کو امتحان سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دینی چاہیے، نتائج کی مشکلات یا مسکرات سے کیوں دھمکایا یا پرچایا جائے!

نیاز صاحب، امید ہے میرے ان خیالات سے آزردہ نہ ہوں گے۔ میں مجبور ہوں، لیکن کیا کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جن سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں، مصیبت کا علاج مسکرات سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی ابھی قاضی عبدالغفار صاحب (صاحبِ نقشِ فرنگ) کی دو تصانیف نظر سے گزریں۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری۔ نقشِ فرنگ کے مطالعہ کے بعد میں قاضی صاحب کی شخصیت اور اَدَب طرازی دونوں کا معترف ہوگیا تھا۔ لیلیٰ کے خطوط دیکھ کر اَدَب طرازی کا اب بھی قائل ہوا، لیکن مجنوں کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے اختیار آہ نکلی کہ

از قبیلۂ مجنوں کسے نماند!

قاضی صاحب نے بھی نوجوانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کی ان کی سیرت و شخصیت سے توقع تھی۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو کوئی ذمہ دارانہ طریق کار نہیں ہے۔نوجوانوں کو" جوانی دیوانی" کا سبق پڑھانا سہل ضرور ہے،لیکن قطعاً "نافرجام" ہے۔یہی چیز عبرت خیز اور مضحکہ انگیز بھی ہو جاتی ہے جب یہ سبق ہم بوڑھے پڑھانے لگتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ہماری اس حرکت پر نوجوان لعنت تو خیر نہیں بھیجیں گے، کیونکہ نوجوان نہ مایوس ہوتا ہے اور نہ مریض، لیکن وہ ہنسنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔

مکتوبات نیاز میں ہر نوع کے خطوط ملتے ہیں جن میں نیاز صاحب نے اپنے مخصوص طرزِ انشاء میں زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔مثلاً عشق و عاشقی، رندی و ہوسناکی، شعر، شاعری یا افسانہ، مذہب، شعراء، اشعار، تصاویر، ماتم پرسی، بیوی اور شوہر کے مناقشات، شادی سے اجتناب، بچوں کے ہوتے ہوئے باپ کو دوسری شادی نہ کرنے کی ترغیب، سانحہ کی اطلاع، مشرقی علم و ادب، غرض ایک پڑھے لکھے خوش مزاج انسان کو بالعموم جو امور زندگی میں پیش آتے ہیں، ان سب پر تنقید کی گئی ہے۔

ان خطوط میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نیاز صاحب نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ جن لوگوں کو انہوں نے خطوط لکھے ہیں وہ نیاز صاحب ہی کے برابر لکھے پڑھے یا صاحبِ ذوق ہیں۔دوسرے یہ کہ نیاز صاحب نے مکتوب الیہ کے انتخاب میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس زمرہ میں وہ لوگ نہ آنے پائیں جن کو نیاز صاحب سے سب سے قریب ہونا چاہیے تھا، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹی، بیٹا، بیوی، ملازمین یا متوسلین تعجب ہے کہ ان کا سابقہ دوسروں کے رشتہ داروں سے ایسا پڑا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو فراموش کر گئے! بعض خطوط میں یہ دریافت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے اور نیاز صاحب سے ان کے تعلقات کیسے ہیں خطوط کا لب ولہجہ یا اُسلوبِ نگارش بالعموم عاشقانہ، شاعرانہ یا رندانہ ہے، طعن و طنز کا عنصر بھی کچھ کم نہیں ہے، لیکن ان سب پر فوق، وہ پندارِ تفوق ہے جس کو نیاز صاحب کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔

نیاز صاحب کے موجودہ اُسلوبِ انشا کی مثال ایک طور پر انگریزی کے مشہور طنزی شاعر جوناتھن سوئفٹ کے ہاں ملتی ہے۔سوئفٹ بھی دنیا اور انسانوں سے بے زار تھا، نظامِ حیات میں اس کو بھی کہیں شگفتگی نظر نہیں آتی تھی، تلخی اور زہرناکی اس کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھے، تاہم اس نے اپنی محبوبہ اسٹیلا کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سادگی الفاظ اور سادگی خیال کے بہترین

نمونے خیال کیے جاتے ہیں۔ اسٹیلا ایک غریب خاندان کی بہت کم پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ سوئفٹ نے اس کو وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں (جنرل ٹو اسٹیلا) ان میں اپنے جذبات، شیفتگی کو سہل سے سہل الفاظ اور چھوٹے سے چھوٹے فقروں میں ادا کیے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی ''سخت وسنگین'' یا زہر میں بجھا ہوا کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی نرم و نازک جذبات کا اسیر نظر آئے گا اور پرائیویٹ لائف یا پرائیویٹ خطوط اس کے بہترین ترجمان ہیں۔ اس بنا پر نیاز صاحب کے خطوط یا تو پرائیویٹ نہیں ہیں یا نرم و نازک جذبات کی ان پر کارفرمائی نہیں ہے یا پھر جو مال اچھا تھا[1]، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے۔

اب میں بعض خطوط کا سرسری جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف ایسے خطوط کا انتخاب کیا ہے جن سے صاحب مکتوبات کے طبعی میلان یا مخصوص طرزِ انشا پر روشنی پڑتی ہے مثلاً

مکتوب نمبر ۵۳: یہ خط نواب صاحب کو لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب عازم حج ہیں۔ برسبیل تذکرہ انہوں نے فرمایا کیا نیاز کا ساتھ ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس پر نیاز صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا ''نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد''

۲۔ آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح وحمائل ہوگی اور یہاں جام و مینا۔

۳۔ ممکن ہے کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکلے اور آپ تسبیح یا استغفر اللہ سے رجوع کریں۔

۴۔ میرے لیے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آیئے گا اور یہ نہ ممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی، لیکن خاکِ شفا اور زمزم کے پانی سے اسے علیحدہ ہی رکھیے گا، ورنہ ممکن ہے خراب ہو جائے۔

اس خط کے مطالعہ سے بذاتہ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نیاز صاحب نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہی اس لیے کہ اس کو ہدفِ ملامت بنائیں۔ اول تو نیاز صاحب کے خیالات معلوم ہوتے ہوئے نواب صاحب کی یہ خواہش کہ نیاز صاحب حج میں ساتھ چلیں، کچھ بے تکی سی معلوم ہوتی ہے، بالفرض نواب صاحب نے از راہِ لطف و محبت یہ خواہش ظاہر بھی کی تو نیاز صاحب زیادہ سے زیادہ ان کو معذور قرار دے سکتے تھے نہ یہ کہ بعض ایسے خیالات کا اظہار کرتے جن سے ان کے

---

(۱) امیر کی ذمہ داری پر نیاز صاحب پورا مصرعہ نقل فرما سکتے ہیں!!

دوست یا مخدوم کی دل شکنی قطعی تھی پھر یہ بھی ہے کہ اب تک حج وغیرہ کے سلسلہ میں شعرا یا رندوں نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں زہد ریائی، تنگ نظری، استعارۃً شراب وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے، لیکن ایک پرائیویٹ خط میں کسی شخص نے آج تک کسی عازمِ حج سے جار جیا کی کنیز کی فرمائش نہیں کی۔ علاوہ بریں اگر لطفِ داستان کے سلسلہ میں ان خیالات کا اظہار ناگزیر تھا تو بھی اس خط کے مکتوب الیہ نواب صاحب براہِ راست نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے جواز کی صورت صرف یہ ہو سکتی تھی کہ نیاز صاحب کسی دوسرے دوست کو خط لکھتے اور ضمناً نواب صاحب کے حج اور جار جیا کی کنیز کا تذکرہ کر دیتے۔

مکتوب نمبر ۷۳: یہ خط ایک حادثہ کا مظہر ہے۔ مجھے ایک مکرّم نے بتایا کہ غالباً نیاز صاحب نے یہ خط اپنے جگر گوشہ کی وفات پر لکھا ہے، لیکن کسی کو اس دردناک حادثہ کی خبر نہ ہو تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خط کس سے متعلق ہے اور نیاز صاحب کے اُس سے کیسے تعلقات ہیں۔ الفاظ میں جوش و خروش، زور و استواری سب کچھ ہے، فقرے اور ترکیبیں باہم دگر چست اور پیوست ہیں۔ انشا و عبارت ادیبانہ ہے، لیکن یہ چیزیں اس درجہ نمایاں ہیں کہ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی چیزیں مقصود بالذات تھیں۔

مکتوب نمبر ۹۰: یہ خط نیاز صاحب ہی کے پیش کردہ ایک شعر کی تفسیر ہے:

بیا کہ رونقِ یک کارخانہ کم نہ شود　　　ز زُہد ہم چو توئی یا ز فسق ہم چو منی

اور نیاز صاحب کے عین اُس رنگ میں جس کے خلاف میں نے انہیں اوراق میں احتجاج کیا ہے اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

مکتوب نمبر ۶۵: سب سے نرالا اور سب سے دل چسپ، خط نہیں ایک مختصر افسانہ ہے۔ دل نشین ظرافت کا نہایت سنجیدہ، رنگین اور شگفتہ نمونہ۔ نیاز صاحب اس خط پر فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے رشک ہے کہ یہ چیز مجھے کیوں نہ سوجھی۔ نیاز صاحب سے میں درخواست کروں گا کہ اس قسم کا کوئی اور واقعہ کبھی پیش آنے تو مجھے ضرور "یاد و شاد فرماتے رہیں گے"۔

مکتوب نمبر ۱۲۵: اس خط کی جان کراما کاتبین کی شادی ہے۔ میں اس خط کو بھی نیاز صاحب کا کارنامہ سمجھتا ہوں گو آخر میں تھوڑے سے بدحظ ہو گئے ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، کراما کاتبین معاف فرمائیں گے۔

مکتوب نمبر ۲۴: اس خط کا پہلا شعر ان تمام اشعار پر بھاری ہے جو نیاز صاحب نے مولانا ابوالکلام کی مانند اپنی مکتوبات میں ہر طرف بکھیر رکھے ہیں۔ کیا کہنے ہیں

بے دیکھے کہہ دیا کہ چنے ہم نہ کھائیں گے — کچّے کہاں ہیں یار، اُبالے ہوئے تو ہیں

مجھے خود اپنا بچپن یاد آ گیا۔ میرے معلّم اوّل ایک 'منشی جی' تھے۔ دوالی کے موقع پر (بہ مناسبت عیدی) ایک دِوالی کہہ کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ اپنے قبلہ گاہی صاحب کو دینا، شعر تھا:

دوالی آمدہ ایام اعلےٰ — چراغاں جل رہے ہیں زیر وبالا

اس خط میں نیاز صاحب نے اپنی طفولیت کا زمانہ یاد کیا ہے اور خوب کیا ہے، لیکن عہدِ طفلی کی جن جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنے ہم عمر ساتھی (یا بقول میرے منشی جی کے، طفل سے) نہیں وابستہ کی جاتیں۔ قصہ سننے کے بچے بڑے آرزومند ہوتے ہیں، لیکن چاند میں بڑھیا کا چرخہ کاتنا یا دیو، پری، طلسمات، توہمات یا شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں بچے ایک دوسرے سے نہیں کہا کرتے بلکہ گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی ہیں۔ شام کو دریا کے کنارے لایعنی طور پر بیٹھے رہنا بھی بچوں کا کوئی محبوب مشغلہ نہیں ہے، البتہ چوری چھپے امرود توڑ کر کھانا اور آنکھ مچولا کھیلنا طفلانہ مشغلوں میں آتا ہے جس کا تذکرہ نیاز صاحب نے کیا ہے، لیکن یہ باتیں بچوں کے ساتھ اس درجہ مخصوص کر دی گئی ہیں کہ ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی۔ یہ بجنسہٖ مولانا راشد الخیری کے ناولوں کا پلاٹ ہے یعنی وہی بیوہ، سوکن، یتیم، نمونیہ، دق اور رات کے وقت جب کڑا کے کی سردی پڑتی ہو صحن میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا وغیرہ۔ ہر شخص کا بچپن اور بچپنے کے ساتھیوں کے ساتھ لطائف وظرائف مختلف اور مخصوص ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ خط میں ان کا تذکرہ یقیناً پُر لطف ہوتا۔

ناظرین! میں نے غلطی کی یہ مضمون لکھ مارا، دوسری غلطی نیاز صاحب کریں گے اگر اسے شائع کر دیں گے اور تیسری اور یقیناً سب سے بڑی غلطی آپ کریں گے اگر اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیں گے۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ مکتوبات نمبر ۱۔ ۱۸۔ ۷۹۔ ۱۰۱۔ ۱۱۱۹ اور ۱۳۴ کا مطالعہ کریں اور مجھے اور نیاز صاحب دونوں کو بخش دیں۔

تا بہ بخشد خدائے بخشندہ!

(نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۴۰ء)

مکتوبات نیاز دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا حصہ ۱۹۴۳ء میں رشید صاحب کا تبصرہ صرف پہلے حصہ سے متعلق ہے۔

م۔ ندیم (علیگ)

لطیف الزّماں خاں

اعمال نامہ

مصنفہ - سر رضا علی

ممکن ہے آپ بھولے نہ ہوں، حال ہی میں مَیں نے ''اپنی یاد میں'' آپ کے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ میں علی گڑھ کا ساختہ پرداختہ ہوں اور مجھ میں ''گُل افشانیٔ گفتار'' علی گڑھ کے ہی ''پیمانۂ وصہبا'' سے آئی ہے۔ اُس وقت مجھ کو معلوم نہ تھا کہ سر رضا علی کے خودنوشتہ سوانح حیات (اعمال نامہ) کے تعارّف کرانے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا اور مجھے ''نجد و یارانِ نجد'' کی یاد سے لطف اُٹھانے کا اتنا جلد موقع ملے گا۔ اعمال نامہ میں سیّد صاحب کی گُل افشانیٔ گفتار بھی علی گڑھ کے ہی پیمانۂ صہبا کی رہینِ منّت ہے۔ سیّد صاحب علی گڑھ کے ''سابقون الاوّلون'' میں سے ہیں جن کو علی گڑھ کی اصطلاح میں پرانے گنہ گار ہی نہیں کٹر کافر کہنا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔ غالب کو شکایت تھی کہ فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جاتے ہیں، آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا۔ سیّد صاحب نے اپنا اعمال نامہ خود ہی مرتّب کر ڈالا۔ مجھے معلوم نہیں قیامت کے دن وکیلِ سرکار اس اعمال نامہ کے بارے میں وہ اعتراض پیش کرے گا یا نہیں جو غالب نے پیش کیا تھا۔ ریڈیو نے تو آج اس اعمال نامہ کو خدائی خواروں کے ہاتھ میں دے ہی دیا۔ سیّد صاحب کے ساتھ میں انصاف نہ کر سکوں تو سیّد صاحب مایوس نہ ہوں، اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔

یہ اعمال نامہ ساڑھے پانسو صفحات پر محیط ہے۔ دوسری جلد کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ اکبر نے تو گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی کہہ کر بہتوں کی مسل داخل دفتر کر دی تھی۔ سیّد صاحب نے اپنی ناگفتنی درج کتب کر کے ''مقدمہ بازیہ نمبر سابق'' قائم کرالیا ہے۔ آج کی صحبت میں اس ناگفتنی پر غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد۔

سیّد صاحب نے علی گرھ کا بہترین زمانہ پایا۔ سر سیّد نے اپنے ہم قوموں کے لیے ہندوستان میں بیسویں صدی کا جو سب سے بڑا کام شروع کیا تھا اُس کو چلانے اور بڑھانے میں ان کے رفقائے کرام ہر ممکن العمل جدّ وجہد میں منہمک تھے ایک ذہین اور مخلص مسلمان نوجوان جس کو اپنے آبا سے معاش وملکیت کم سے کم اور مشرقی آداب واقدار کا ترکہ زیادہ سے زیادہ ملا ہو

اس کے لیے علی گڑھ کا یہ زمانہ سونے پر سہاگا کا کام دے گیا۔

اعمال نامہ میں قدیم علی گڑھ کی بساط پر وہ تمام مہرے ملتے ہیں جنہوں نے قومی سرگرمیوں میں مات کھائی یا مات دی ہے۔ موجودہ علی گڑھ کا رنگ و آہنگ ممکن ہے مختلف ہو۔ ''لذّتِ خوابِ سحر'' باقی رہی ہو یا نہیں، ''بادۂ شبانہ کی سرمستیاں'' کسی نہ کسی شکل اور کسی نہ کسی حد تک اب بھی موجود ہیں۔ بادۂ و ساغر کے بدلنے سے سرمستیاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ رند میخانہ کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے اور جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے۔ سیّد رضا علی علی گڑھ کے اُنہیں رندانِ قدح خوار میں سے ہیں۔

علی گڑھ کا یہ رند جہاں رہا علی گڑھ کے تصرفات سے زندگی کا مقابلہ بھی کرتا رہا اور زندگی سے بہرہ مند بھی ہوا۔ علی گڑھ میں یونین کے الیکشن جیتے، خاندان میں ساس بہو کی لڑائی چکائی، عدالتوں میں مقدّے لڑائے، پبلک پلیٹ فارم پر تعلیمی اور سیاسی مسائل سلجھائے، جنوبی افریقہ میں ملکی و غیر ملکی کشاکش کا مقابلہ کیا، مجلسِ بین الاقوام میں ''ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خودمختاری کی'' کا بھی مزہ اُٹھایا، پبلک سروس کمیشن میں اعلیٰ عہدوں کے لیے اعلیٰ اشخاص منتخب کیے، کونسل میں ہماری نیابت کی، شعروادب کا مطالعہ کیا اور منزلت پائی۔ عشق و محبت میں فرہاد و مجنوں سے پیچھے تو بہتوں سے آگے رہے۔ نفع میں البتہ کسی سے کم نہ رہے۔ دیوانوں میں دیوانے اور فرزانوں میں فرزانے رہے۔ گو جی یہی چاہتا ہے کہ وہ دیوانوں میں دیوانہ نہ رہتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ فرزانوں میں دیوانہ ہی رہتے۔ وہ منصرمی سے نائٹ ہڈ تک پہنچے۔ یہ توفیقِ انسانی تھی، دیکھیے توفیقِ الٰہی ان کو کہاں تک پہنچاتی ہے۔

سیّد صاحب نے آنکھ مرادآباد میں کھولی، تعلیم علی گڑھ میں اور شہرت ہر جگہ پائی۔ اعمال نامہ میں انہوں نے اپنی ہی ترازو میں اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ وہ تول میں کیسے اترتے ہیں۔ اوزان مختلف ہو سکتے ہیں۔ آپ صرف یہ دیکھتے رہیں کہیں میں ڈنڈی تو نہیں مار رہا ہوں۔ تولنے کا پیشہ ہندوستان میں ذرا بدنام ہے۔ گاہک کو باخبر رہنا چاہیے۔ اس اعمال نامہ کے بارہ میں سیّد صاحب نے ایک اور موقع پر کہا تھا کہ بیروں کے ذائقہ کے بارہ میں کونجڑن کی رائے مستند نہ ہوگی۔ یہ کام بیر کھانے والوں کا ہے، وہ بتائیں کہ بیر کیسے ہیں۔ سیّد صاحب نے بات تو بڑے پتہ کی کہی یہاں تک کہ ''عزتِ سادات'' کا بھی کچھ زیادہ خیال نہ کیا، لیکن میں خود ان بیریوں میں سے ہوں (بیری سے خواہ آپ دشمن مراد لیں خواہ ماہرِ بیر) جو بیر

سے زیادہ کو نجزن کو نظر میں رکھتے ہیں۔

سیّد صاحب شعر بہت برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اس بارہ میں میرا یہ عقیدہ ہے کہ جس آدم کو شعر برمحل پیش کرنا نہ آتا ہو، وہ برمحل کوئی کام کیا کرے گا۔ اچھے شعر کا ذہن میں فی الفور آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری قوتِ فیصلہ تیز اور مستحکم ہے اور ہم مسرت ہی کو نہیں دکھ اور دشواری کو بھی حسن و دل بری میں منتقل کر سکتے ہیں۔ میں کسی شخص سے ملتا ہوں تو یہ دریافت کرنے کا بھی آرزومند رہتا ہوں کہ وہ شخص اچھا اور برمحل شعر بھی پڑھنے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا، بندھے ٹکے فرسودہ اشعار پڑھتے رہنے سے باز نہیں آتا تو میں اپنے اعمال نامہ میں اس کی بداعمالی لکھ لیتا ہوں۔ سیّد صاحب نے جہاں تہاں اس قسم کی بات روا رکھی ہے، لیکن وہ اطمینان رکھیں میں اپنی بداعمالی اُن کے اعمال نامہ میں نہ لکھوں گا۔

کتاب ایک مختصر سے دیباچہ سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں اعمال نامہ کے اعتذار میں سیّد صاحب بعض بڑی پُر لطف باتیں بیان کر گئے ہیں، یہیں کہیں اُردو ہندی مترادفات کی بحث آگئی ہے۔ سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ان کو عربی، فارسی الفاظ کے بجائے ہندی کے چبھتے ہوئے الفاظ ملتے ہیں تو وہ ہندی ہی کے الفاظ کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً وہ خوب صورت کے بجائے روپ، طرح دار کے بجائے چھبیلا کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔ البتہ اس قسم کے اصول کو احتیاط پر ترجیح نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خوب صورت اور روپ میں فرق ہے۔ چھبیلا اور طرح دار میں بھی۔

تھوڑے بہت فرق کو نظرانداز کر دینے سے کسی کی گرفت ''ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ'' میں نہیں ہو سکتی، لیکن زبان کے مزاج بولنے والے کے ذوق، الفاظ کے ترنّم اور مفہوم کی نزاکت کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ طرح دار کا لفظ ایک موقع پر حسرت نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طُرفہ عالم ہے، ترے حُسن کی بیداری کا

یہاں چھبیلا اور طرح دار کا مقام دریافت کرنا دل چسپی ورنہ عبرت سے خالی نہ ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہندی میں بکثرت ایسے حسین الفاظ ہیں جن کا بے کم و کاست مترادف مجھے عربی فارسی میں نہیں ملتا۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ مترادفات علوم میں ہوتے ہوں تو ہوں شاعری میں نہیں ہوتے۔ دلّی کے ایک بڑے آزمودہ کار لیڈر اور شعر و ادب کے پارکھ نے

ایک بار آل انڈیا قسم کی ایک تعلیمی کانفرنس میں فرمایا ''میں تو آشیانہ کی جگہ گھونسلا استعمال کرتا ہوں'' ایک طرف سے نحیف آواز آئی جزاک اللہ، کوّے کا سامان تو ہو گیا، غریب بلبل البتہ کہیں کا نہ رہا۔

سیّد صاحب نے مرثیہ گوئی میں انیسؔ و دبیرؔ کا موازنہ کیا ہے اور شبلیؔ کی مشہور تنقید موازنہ پر بڑی بے لاگ رائے دی ہے۔ مجھے سیّد صاحب کے محاکمہ سے اس حد تک اتفاق ہے کہ انہوں نے دبیرؔ کا حق ادا کر دیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شبلیؔ نے کچھ بھی نہ لکھا ہوتا تو بھی انیسؔ اس درجہ پر فائز رہتے جس پر شبلیؔ نے نہیں خود شاعری نے انیسؔ کو فائز کر دیا ہے۔ انیسؔ سے فن کا بھرم قائم ہے، دبیرؔ کا فن سے ہے۔

سر رضا نے اپنے زمانہ یا علی گڑھ کے قرونِ اولیٰ کے حالات و حوادث کو جس لطف جرأت اور وضاحت سے پیش کیا ہے اس کی صحیح داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے علی گڑھ کی گلیوں میں جوانی کھوئی بھی ہے اور پائی بھی۔ طلباء کی زندگی کیا تھی، حکومت اور کالج کے اکابر منتظمین میں کیا آویزش تھی۔ ملک و قوم میں علی گڑھ اور علی گڑھ کے سرداروں کا کیا درجہ تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی پیش نہاد کیا تھا۔ یہ تمام باتیں موقع موقع سے متانت و دیانت اور زبان و بیان کے لطائف و ظرائف کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ محسن الملک اور وقار الملک کی سیرت و شخصیت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''محسن الملک کی رائے میں ضرورت سے زیادہ لچک تھی اور وقار الملک کی رائے میں کہیں لوچ کا پتہ نہ تھا۔'' عرفِ عام میں اُس آدمی کو جس میں اس درجہ لچک ہو کمزور اور جو اس طرح کا بے لوچ ہو، ضدّی کہتے ہیں۔ اس عہد کے علی گڑھ کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں'' سر سیّد نے مولویوں کی کبھی پروانہ کی۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے۔ نواب محسن الملک بڑے آزاد خیال فرقوں کی قید سے آزاد اور ٹھیٹ مسلمان تھے۔ مسلمان سر سیّد کے مذہبی عقائد سے بددل تھے۔ محسن الملک قوم کی بالخصوص علماء کی تالیف قلوب کرنا چاہتے تھے۔ یہ نہ کرتے تو سر سیّد میموریل فنڈ کی تحریک کیسے کامیاب ہوتی۔ بادل ناخواستہ موصوف نے علماء کی آؤ بھگت شروع کر دی مگر یہ بات ان کے ذہن میں نہ تھی کہ کالج تو کمبل چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے مگر کمبل کالج کو نہ چھوڑے گا۔ نواب وقار الملک کے عہد میں علماء کا رسوخ بہت بڑھ گیا۔ موصوف نے جو کچھ کیا نہایت نیک نیتی سے کیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء کی آزادیٔ خیال، جستجوئے حق اور طلب راستی کی سوت جو سر سیّد کے آخر زمانہ میں پھوٹی تھی، اگر سوکھی نہیں تو اس کی روانی میں کمی آ گئی۔ نواب محمد اسحٰق کے زمانہ میں علماء کے اقتدار و وقار کا آفتاب اگر

نصف النہار پر نہیں تو اس دقیقہ پر پہنچ گیا جہاں سورج جون کے مہینہ میں دن کے گیارہ بجے پہنچتا ہے۔ نواب محمد علی کا زمانہ حضرت علی کی خلافت سے مشابہ تھا۔ علاوہ اور مشکلات کے ان کو ترکِ موالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پہلے بیرونی حملے ہوتے تھے اب اندرونی جنگ بھی شروع ہوگئی۔"

ایک بحث کے سلسلہ میں سیّد صاحب فرماتے ہیں: "سرسیّد احمد خان کی اصلاحی تحریک کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ مغربی ممالک کے حالات طرزِ معاشرت اور ادب پر بغیر کافی عبور رکھے ہمارے بزرگ ہر مغربی چیز کو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔"

سیّد صاحب کو محسن الملک سے بڑا شغف تھا۔ اعمال نامہ میں انہوں نے محسن الملک کی سیرت اور کارناموں اور ان کی لغزشوں کو بھی بڑی دیانت، محبت اور لطف سے بیان کیا ہے۔ اس دیانت، محبت اور لطف سے کہ جو شخص سر رضا اور محسن الملک کو نہ بھی جانتا ہو وہ بھی ان دونوں سے محبت کرنے لگے۔ یہ خلوص اور انشا پردازی دونوں کا کمال ہے۔

اعمال نامہ کا وہ جز خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے جہاں سر رضا نے اُردو کے مسئلہ پر سر انٹونی میکڈانلڈ، گورنر صوبۂ متحدہ اور محسن الملک کی آویزش کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور کی ابتدا اسی آویزش کا نتیجہ ہے۔ سیّد صاحب کا بیان ہے کہ صوبۂ متحدہ کی حکومت کا مدار اپریل ۱۹۰۰ء کا رزولیشن مسلمانوں میں سیاسی بے داری کا اصل سبب اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہونے کی بنیادی وجہ ہے۔ سر انٹونی میکڈانلڈ نے جو بیج اس تاریخ میں بویا تھا اس نے رفتہ رفتہ چھ سال کے عرصہ میں زمین کے اندر جڑ پکڑی اور آخر دسمبر ۱۹۰۶ء میں ایک کمزور پودے کی صورت میں ڈھاکہ کی سرزمین پر ظاہر ہوا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پودے کو بڑا اور گھنا، سرسبز اور شاداب نہ ہونے دے گا۔ جس کا دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمبئی کی سرزمین پر انڈین کانگریس کی صورت میں پھوٹا تھا۔

سیاسی مسائل پر سیّد صاحب حکومت وابنائے ملک کے "جان ہے تو جہان ہے" نہیں پیش کیا ہے۔

ایقان کو اپنی بڑی طاقت سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس میں ایک جرأت اور ایک قانون داں اور قانون پیشہ کے سلیقہ اور دلائل کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے۔ ہندوستانی ریاستوں اور حکومت ہند کے باہمی تعلقات کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"کسی معاہدہ کی صحیح تعبیر دو نابرابر فریقوں کے درمیان نہیں ہوسکتی۔ معاہدوں کی صحیح

تعبیر اور رضامندی کا سوال اس صورت ہی میں پیدا ہو سکتا ہے جب دونوں فریق اپنی تعبیر پر مُصر رہنے اور رضامندی دینے یا نہ دینے کا حق رکھتے ہوں۔''

سیکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے سے لے کر کلکٹر اور ججوں تک کے رویّہ پر سیّد صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی صفائی سے کیا ہے اور حسبِ موقع ان پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور اُن کو سراہا بھی ہے۔ اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز رفیقوں کا تذکرہ بڑی محبت سے نام بہ نام کیا ہے۔ بیسویں صدی کے پولیٹیکل بہی کھاتہ کا جمع خرچ بڑے دل نشیں انداز سے پیش کیا ہے اور حالات وحوادث کے اس فریم میں مسلم اداروں، مسلم تحریکوں، مسلم شخصیتوں اور مسلم تصورات کی مختلف و متنوع تصاویر کو بڑے خلوص اور ہنرمندی سے نمایاں کیا ہے۔ پبلک لائف کے اس ماگھ میلے میں آپ کو سیّد صاحب ہر مشہور اور دل چسپ مقام کی سیر کراتے ہیں اور اس الفت اور ہنرمندی سے کہ آپ کسی مقام یا منظر سے گھبرائیں یا اکتائیں تو سیّد صاحب کی محبت ورفاقت سے تازہ دم ہو جائیں۔

اعمال نامہ کے وسط میں اور ''مجوزہ مسلم یونی ورسٹی'' اور ''ایجوکیشنل کانفرنس'' کے عین درمیان کلکتہ کی گوہر جان کو جگہ دے کر سیّد صاحب نے بہتوں کی نجات کا سامان کر دیا۔ جس کے لیے سیّد صاحب عنداللہ ماجور ہوں یا نہیں، عندالنّاس یقیناً مشکور ہوں گے۔ شعروں کے انتخاب نے غالبؔ کو رسوا کیا ہو یا نہیں، گوہر جان کے انتخاب نے سیّد صاحب کو اپنے ہی اعمال نامہ کا نہیں بہت سے دوسرے بے زبان نیازمندوں کے اعمال نامہ کا ہیرو ضرور بنا دیا۔ بذاتِ خود میں سیّد صاحب کے نقل کیے ہوئے گوہر جان کے گانوں کو اپنے اعمال نامہ میں ضرور جگہ دوں گا۔ بشرطیکہ سیّد صاحب نے اس کے حقوق محفوظ نہ کرا لیے ہوں۔

''میرا مذہب'' کے عنوان سے سیّد صاحب نے بعض بڑے دقیق اور نازک مسائل پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سیّد صاحب ان مسائل کو جتنا خود سمجھ چکے ہیں اتنا دوسروں کو سمجھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور رہ رہ کر توبتہ النصوح کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ہر شخص کو یقین ہے اور اس کی مسرّت بھی کہ سیّد صاحب خوش عقیدہ سُنّی دادا کے پوتے اور آزاد خیال شیعہ باپ کے بیٹے ہیں اور علی گڑھ کی برادری میں شامل ہیں۔ وہ برادری جو موجودہ عہد میں میرے نزدیک سب سے اچھی برادری کا نمونہ ہے۔

سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو زبان نے اپنا سرمایہ فارسی سے لیا ہے یا ہندی سے۔

گلاب کی کاشت

خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد ہشتم پیشِ خدمت ہے۔ حوالے حواشی نہیں لکھے جا سکے اس کے دو سبب ہیں۔ جب سے موبائل ٹیلی فون استعمال میں آیا ہے اُن پڑھوں کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ تعلیم یافتہ حضرات نے بھی خط لکھنا اور خط کا جواب لکھنا ترک کر دیا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم دونوں کو ضعیفی اور امراض نے بے بس کر دیا ہے۔ اُمید ہے کوئی علی گڑھ کا شیدائی کوئی رشید صاحب کو چاہنے والا اس کام کو مکمل کرے گا۔

ضمیمہ میں ان اکابرین کے خطوط ملاحظہ فرمایئے جنھوں نے رشید صاحب کو عزیز رکھا۔

مہر الٰہی ندیم (علیگ)

۴/۱۷۰۷ مزمل منزل،

سول لائنز، علی گڑھ،

یو۔ پی، انڈیا۔

پنج شنبہ، ۲۶؍محرم ۱۴۳۰ھ

لطیف الزماں خاں

سی ۱۴۹/، غالب نما،

حالی روڈ، گل گشت،

ملتان۔۶۰۷۰۰

اتوار، ۳۱؍جنوری ۲۰۰۹ء

بنام

آغا سرخوش قزلباش صاحب

(ایڈیٹر ''گہوارہ'')

(۱)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اکتوبر ۱۹۶۶ء

محترمی، تسلیم۔

نوازش نامہ صادر ہوا جس میں آپ نے اُردو کے ادبی ماہنامہ گہوارہ کے شائع کرنے کا مژدہ سنایا ہے اور مجھ سے لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار اس امر کے کافی ضمانت ہیں کہ رسالہ ہر اعتبار سے اچھا اور مقبول ہوگا اس سلسلے میں آپ نے یاد کیا تو خوش ہونے کے ساتھ ساتھ شکرگزار بھی ہوا لیکن اب کچھ اس طرح کا عالم ہے کہ جتنا عزیزوں کے کرم سے خوش ہوتا ہوں اتنا ہی اپنی معذوری یا بدتوفیقی پر نادم بھی۔

آپ مجھ سے مضمون نہیں دُعا طلب کیا کیجیے البتہ یہ نہیں معلوم کہ دعائے کہنہ سالاں مقبولِ یزدانی ہوتی بھی ہے یا نہیں، تنبکی کے زمانے میں تو ہو جایا کرتی تھی لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دُعا کے قبول ہونے کا مدار اس پر نہیں ہوتا کہ کون مانگ رہا ہے بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ کس کے لیے مانگی جارہی ہے۔ ایسا ہے تو آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ دُعا قبول ہوگی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

◈◈◈

بنام

آلِ احمد سُرور صاحب

(۱)

۱۵ر ستمبر

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

سُرور صاحب!

میں ۱۳ر کی شام کو واپس آیا۔ آپ نے جو ہدایات اپنے خط میں لکھی ہیں ان کو پورا کیا جائے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے ہاں ضرور ٹھہریئے۔ مجھے یقین ہے وہ بہت خوش ہوں گے۔ احتیاطاً و اخلاقاً میں انہیں ایک خط بھی لکھ دیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب دو باتیں جو آپ نے لکھیں ان میں سے ایک سے میں لطف اندوز ہوا اور دوسرے سے بدحظ۔ ڈاکٹر صاحب جس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس کو مدِ نظر رکھیے تو متفقہ اعلان اپنی جگہ پر ٹھیک نظر آتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہندو مسلم مفاہمہ ہو۔ خواہ اس مفاہمہ کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انگریز مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے منجانب اللہ مامور ہیں اور ہر وہ مفاہمہ جو ہندو مسلمانوں کے درمیان ہو اس صورتِ حال کا منافی ہے۔ بہرحال یہ داستان نفسیات کا ایک دلچسپ باب ہے جس کو مجھے اُمید ہے آپ خوب سمجھتے ہوں گے۔

کمیشن والوں نے البتہ عجب مخمصہ پیدا کر دیا ہے۔ اب تو ان سے اور اپنے دونوں سے نفرت ہونے لگی ہے۔ ان دونوں اُمور پر ڈاکٹر صاحب کو خط لکھوں گا۔ رسالہ اُردو کے جتنے پرچے غائب ہیں اتنا آرڈر ضرور دے دیں اور ۳۵ء اور ۳۶ء کے فائل کا بھی۔

میں لیڈنگ آرٹیکل لکھ دیا کروں گا لیکن آپ کو فرصت ہُوا کرے تو ایک آدھ صفحہ آپ بھی لکھ دیا کیجیے گا۔ ایڈیٹوریل نہ سہی مضامین کی تو بھرتی ہوتی رہے گی۔

میں نے اس سفر میں بڑی زحمت اُٹھائی جو غیر متوقع نہ تھی۔ زیرِ بار بھی ہوا اور مزید زیرِ باریوں کا بارِ گراں بھی اُٹھا لیا اس لیے اب علی گڑھ سے ہل نہیں سکتا۔ آپ کو سفر کا موقع ملا ہے،

میری رائے ہے کہ اس سے 'بھرپور' لطف اُٹھائیے۔ معلوم نہیں پھر اس کا موقع ملے یا نہ ملے۔ سفر کرنے اور لوگوں سے ملنے سے ظرف میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظرف کو میں نے بڑے وسیع معنوں میں لیا ہے۔ دُنیا کی ساری محرومی تنگ ظرفی سے ہے۔ سفر کرنے، زندگی کے مختلف مناظر و ماثر دیکھنے اور سہنے سے ہر شخص کو اپنی صحیح جگہ معلوم ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ موقع اس قسم کی فلسفہ سرائی کا نہیں ہے۔ میں نے آپ کے کہنے کے مطابق پٹنہ سے واپسی پر آٹھ روپے شان الٰہی صاحب کو دے دیئے تھے۔ اس کا حال آپ کو معلوم ہے یا نہیں۔ موسم یہاں نہایت اچھا ہو گیا ہے، اب بارش ہوا سب کچھ ہے، سولن یاد آ رہا ہے، سولن میں تھا تو جوانی یاد آتی تھی، جوان تھا تو کچھ نہیں یاد آتا تھا۔ اب تو وہ دن بھی دُور نہیں معلوم ہوتا جب صرف ڈاکٹر ضیاء الدین یاد آئیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی عاقبت بھی!

بمبئی میں دو بار گیا ہوں۔ خوب جگہ ہے بشرطیکہ والدین قریب نہ ہوں اور ڈاکٹر ضیاء الدین یاد نہ آئیں۔ کپڑے والوں سے خوش نما اور سستے کپڑے خریدیئے۔ باب ہند پر ہوشان بمبئی پر غم و غصہ کہاں، چوپاٹی کی ایک مشہور دوکان پر آئس کریم نوش فرمایئے اور رات کو مولانا عبدالماجد کے یاجوج اور مولانا ابوالکلام کے طاغوت پر لعنت بھیجئے اور سو رہیے۔ اندھیری کالج جایئے تو نجیب اشرف صاحب اور بذل الرحمٰن صاحب سے ملیے اور یہ لوگ اخلاق و شرافت سے ملیں تو میرا سلام کہیے۔ بمبئی کے کسی سینما کمپنی میں ہمارے ہاں کے ایک طالب علم ملازم ہیں جن کا نام میں بھولتا ہوں آپ شاید جانتے ہوں۔ یہاں یوٹی سی میں تھے اور ڈراما وغیرہ میں دلچسپی لیتے تھے۔ کچھ دنوں اُردو ایم اے کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ صاف رنگ، چھریرا بدن وغیرہ وغیرہ۔ اختر حسین علیگ بی اے ایل ایل بی وہاں ایم ایل اے ہیں اور لیبر پارٹی کے نمائندہ اُن سے ملیے اور میرا ذکر کیجیے۔ آپ کی خاطر مدارات کریں گے۔ بمبئی کرانیکل میں باسط میاں تھے اُن سے بھی ملیے۔ سیدین صاحب کے بھائی بھی وہیں کہیں ہیں۔ ان سے سب علی گڑھ والوں کا پتہ چل جائے گا۔

اب میں اُکتا گیا ہوں اور خط بھی بہت سارے لکھنے ہیں اس لیے خدا حافظ۔ والد صاحب سے میرا اسلام نیاز کہیے۔ آپ کے ۔۔۔۔ کمال کے پاس ہیں۔ اس خط کو پڑھ کر فوراً چاک کر دیجیے گا۔

آپ کا

رشید

بنام

سید آلِ محی الدین صاحب ہادی نقش بندی

ایڈیٹر رسالہ ''بیداری'' (پندرہ روزہ) علی گڑھ

(۱)

۲۴ر مارچ ۱۹۴۲ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیزم ہادی صاحب!

خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ نے ''بیداری'' نکال کر اپنے جوان ہونے کا ثبوت دیا اور میں یہ دو چار کلمات (بطور پیغام) لکھ کر اپنے لیڈر قرار دیئے جانے کی کوشش میں مبتلا ہوں۔ آپ یقیناً عند النّاس مشکور اور میں غالباً عند اللہ مردود ہوں گا۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز سواد شمنوں کی جان سے دُور، ہماری آپ کی جان سے گراں اور نایاب ہے آپ کا سلیقہ اور پابندی سے اخبار نکالنا بڑی ہمتِ کا کام ہے۔ خدا آپ کو آپ سے بچائے۔ نوجوانوں کو ان دنوں میں یہی دعا دیتا ہوں۔

آپ کی غالباً اتنی عمر بھی نہ ہوگی جتنی میری زندگی علی گڑھ میں ہوئی۔ اس درمیان میں مَیں نے کتنے ہی نوجوان اور لیڈر دیکھ ڈالے۔ ان کے اور قوم کے انجام بھی دیکھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نہ کبھی جوان ہوا اور نہ لیڈر۔ مولوی بننے کی صلاحیت نہ پائی ایسی حالت میں شریف آدمی کو مسخرہ بننے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔

مزاح المومنین کے سلسلہ میں آپ کو لیڈر کہا کرتا ہوں جس طالب علم کی حاضری کم ہوتی ہے لیکن نظر ہر جگہ آ جاتا ہے اسے میں لیڈر قرار دے دیتا ہوں۔ تقریر کرنے اور نعرہ لگانے لگے تو مہا لیڈر، حفظ مراتب چھوڑ دے تو مہا مہو لیڈر اور اسی سلسلہ میں جیل خانہ جانے سے بچ نکلے

تو پھر لیڈر رمہا مہاو پادھیا، مجھے امید ہے آپ ان مراتب پر غور کر کے آگے بڑھیں گے۔

آپ مسلمان ہیں، میں بھی مسلمان مروں گا۔ آپ کا اخبار بھی مسلمانوں کا اخبار ہے اور اس کا حشر بھی غالباً ایسا ہی ہوگا۔ آپ لیڈر بھی ہیں اس لیے آپ کا انجام تو خاطر خواہ ہوگا۔ البتہ وہ قوم جس کو مصلحتاً مسلمان اور اخلاقاً ہندوستانی کہتے ہیں اور جس کے آپ لیڈر رہوں گے آپ کو ایسے آداب القاب سے یاد کرے گی کہ آپ کو جنت میں کبھی چین نہ آئے گا بشرطیکہ جنت کے سارے نعائم آپ یہیں نہ صرف کر چکے ہوں۔

آپ نے اصرار کیا ہے کہ میں آپ کے اخبار کے لیے کچھ لکھ دوں۔ آپ اُمید کرتے ہوں گے کہ میں کچھ ایسی باتیں لکھوں گا جس سے آپ کے اخبار پڑھنے والے ہنسنے لگیں گے لیکن میری دقت کا بھی تو اندازہ فرمایئے۔ ہمارے آپ کے درمیان ایسے لوگ بھی تو ہیں جو سرے سے ہنسنا ہی نہیں جانتے۔ وہ بے سمجھے ہنستے ہیں یا ایسی باتوں پر ہنستے ہیں جو میرے زبان یا قلم سے نکل جائیں تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروں اور بھلے مانسوں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔ کچھ لوگ بڑے سستے داموں ہنسنے لگتے ہیں یا محض اس بات پر ہنسنے لگیں گے کہ چونکہ دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے، اس لیے احتیاطاً ہنس لینا ہی مناسب ہے۔

میں بہت سے ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو میری خدمات کا پیشگی معاوضہ دینا پسند کرتے ہیں یعنی قبل اس کے کہ اُن سے کچھ کہا جائے وہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں، غالباً اس احتیاط کی بنا پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہنسی کا موقع آئے تو وہ اونگھتے ہوں۔ اس لیے پیشگی قرض اُتار رکھنا زیادہ بہتر ہے! کچھ محتاط لوگ بھی ہیں جو کسی ہنسکار (بر بنائے فن کار یا واقف کار) کو نظر میں رکھتے ہیں کہ وہ ہنسے تو خود بھی ہنس پڑیں۔ جیسے انگریزی کھانا کھانے کے طور طریقوں یا عیدین کی نماز میں ہم آپ کسی دوسرے کا ہاتھ چھوڑنا یا باندھنا کنکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض ایسے بزرگ بھی ہیں جو کسی داموں نہیں ہنسیں گے۔ یہ لیڈر ہوتے ہیں۔ لیڈر ہنستے رہیں۔ رونا کس بات کا۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان ہنسنے الا جانور ہے لیکن ہم سب جتنے جانور ہیں اتنے ہنسنے والے نہیں ہیں۔ ہندوستانی بہت کم ہنستا ہے۔ وہ تو صرف طرح طرح سے روتا ہے، چیختا ہے یا بسورتا ہے۔ ہماری زندگی ہی ایک مستقل رونا بن گئی ہے۔ جو نہیں روتا وہ غصہ میں آ کر چیختا ہے۔ نعرے مارتا ہے، سازش کرتا ہے، نہ رسوا ہونے سے ڈرتا ہے، نہ رسوا کرنے میں دریغ کرتا ہے، یہ باتیں اسلام کی نہیں مسلمانوں کی ہوں تو ہوں۔ آپ ہم مسلمان ہی تو کہلاتے ہیں لیکن ہم میں آپ میں کتنے ہیں

جو مسلمان کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کتنوں نے کہی ہیں اور اتنی کہی ہیں کہ اب ان میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ سوا اس کے کہ کہنے والے پر جی کھول کر ہنسا جائے، لیکن ان کو کیا کہیے جو مسلمانوں کو خدا جانے کیا کیا یاد دلا کر ان کو جوش میں تو لاتے ہیں لیکن اس جوش سے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے دیں یا فائدہ پہنچائیں خود ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

آپ نے اشتراکیت کا نام تو سُنا ہوگا جس کی بدولت کچھ اور نہیں تو اُردو میں ہمارا سابقہ انقلاب سے اتنا نہیں جتنا کہ شعرائے انقلاب سے ہوا۔ اس اشتراکیت کی بنا پر ہم کو بتایا گیا ہے کہ محنت و معاوضہ، گرانی و فراوانی، طاقت و عافیت، عصمت و عورت، عبد و معبود سب کی تقسیم غلط ہے، لیکن کیا ہم آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس زمانہ میں ہمارے لیڈر اور عوام بالکل اُسی نوعیت کے ہیں جو نوعیت سرمایہ دار اور مزدور کی ہے۔ عوام کے جوش و جنوں، دار و رسن، رنج و محن سے کون فائدہ اُٹھاتا ہے۔ وہی لیڈر جو اُن کو اتنا بھی نہیں دیتا جتنا کہ سرمایہ دار مزدور کو دیتا ہے!

اسلام کے بارے میں آپ ہی کے ایک بڑے نامور اولڈ بوائے نے کسی موقع پر کہا ہے کہ اسلام ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا ہے۔ ہم کربلا کے بجائے ہر تقریر یا کانفرنس کے بعد اسلام کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ خواہش اس درجہ ترقی کر گئی ہے کہ اب ہم واقعی محسوس بھی کرنے لگے ہیں کہ اسلام کربلا کے بعد نہیں بلکہ کانفرنس کے بعد زندہ ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے یا لیڈروں سے پوچھا ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ یزید کے مار ڈالنے کا شرف تو کسی کو حاصل ہو اور حسینؓ کی جگہ خاک و خان میں کوئی اور لتھڑے۔ یہ کہاں کی منطق ہے کہ ہم نے تقریر کر دی تو ہم مسلمان، تم کو عمل کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو تم مردود۔ اسلام کا نام بڑے بول سے نہیں، بڑے کام سے اونچا ہوا تھا۔ نعرہ مت لگایئے، عزم کیجیے، دوسروں کو رُسوا کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اپنے ایمان و عمل پر بھروسہ کیجیے۔ مالِ طیّب، مالِ غنیمت سے بہتر چیز ہے!

علی گڑھ یونی ورسٹی ایک علمی مرکز ہے جس کو سیاسی جد وجُہد کا آلہ کار بنانا میرے نزدیک ناواجب بات ہے۔ یہاں ہر طرح کی تحریک اور اس کے لیڈر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ علی گڑھ کو ہر طرح کی تحریک اور لیڈروں کی آماجگاہ بنانا بڑی بھاری غلطی ہے۔ آپ کا زمانہ سیکھنے پرکھنے اور آمادہ ہونے کا ہے، آنکھ بند کر کے نعرہ لگانے یا کود پڑنے کا نہیں ہے۔ میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں میں کسی تحریک کے سمجھنے، تولنے اور اس کے لیڈر کو پرکھنے اور

پرکھتے رہنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہو رہی ہے بلکہ آپ آنکھ بند کر کے ہر تحریک یا لیڈر کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ آپ خود جلد سے جلد لیڈر بن جانا پسند کرتے ہیں اور لیڈر بننے کے لیے جس سوجھ بوجھ جس تیاری جس مطالعہ اور جس ریاضت کی ضرورت ہے اس سے بچنا چاہتے ہیں۔

جلد سے جلد لیڈر بن جانے کے لیے ایک موقع بڑا راس آتا ہے۔ یعنی جب ہر طرف اختلال وابتری چھائی ہو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت حالت کچھ اسی قسم کی ہے لیکن میں چاہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ اس کا شکار نہ بنیں۔ جو لیڈری سستے داموں یا بغیر استحقاق کے ملے وہ لیڈری نہیں کمزور شخصیتوں یا بُری نیتوں کی پاداش ہے۔ اس سے خود بچیے اور اپنے ساتھیوں کو بچایئے۔ خدمت لینے سے خدمت کرنا بہرحال اور بدرجہا افضل ہے۔ فضیلت وفوقیت نعروں سے نہیں تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کی بشارت یہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ جی چاہے تو سرسیّد سے رجوع کیجیے۔

خیر اندیش
رشید احمد صدّیقی

بنام

اقبال رشید صدّیقی صاحب

(۱)

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۰/اپریل ۱۹۵۹ء

اقبال،

تمہارا ۱۳/ کا لفافہ پرسوں ۱۸/ کو ملا۔ تم نے جس صفائی اور وارفتگی سے یہ خط لکھا ہے اس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا یعنی میں نے اسے جلد سے جلد پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر سے دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گو جب سے آج تک برابر وہ میری لکھنے والی تختی میں لگا ہوا ہے۔

میری زندگی تو جس طرح گزری، گزر گئی، کچھ ایسی بُری نہیں گزری تھی البتہ تقسیمِ ملک کے بعد سے بڑی مشکلات اور مایوسی سے دوچار ہوا جیسے جھٹکوں نے زندگی کی ساری جڑیں اکھیڑ دی ہوں۔ دن بہ دن حالات بدتر ہوتے رہے۔ پھر بیماری کی مصیبت، اس میں طرح طرح کے انکشافات۔ اس کے بعد ریٹائر ہونا۔ اس کے شدید نفسیاتی ردِعمل اور جیسے یہ سب کافی نہ تھا، مُنّی کا سانحہ[1]۔ بس یہ سمجھو جیسے اناج کا کوئی دانہ بھڑ بھونجے کی جھُلستی ہوئی ریت میں پھینک دیا گیا ہو۔ اب مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کسے معلوم نصیبے میں ابھی اور کیا دیکھنا رہ گیا ہے، لیکن زندگی جیسے شعوری نہ رہ گئی ہو جیسے میری نبض کی ضربیں miss ہوا کرتی ہیں اس طرح جن کا خیال رہ رہ کر جھٹکے دیتا ہے اور جب اس کا خیال نہیں رہتا اس وقت بھی ایک طرح کا خلا غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا رہتا ہے۔ میں کیا بتاؤں وہ کتنی غریب اور اچھی تھی کیسے کیسے منصوبے میرے ساتھ گفتگو کر کے اس نے بنا رکھے تھے، کتنے شریفانہ منصوبے!

اچھا رخصت۔۔۔میری طبیعت بے قابو ہونے لگی۔ میرے خط پڑھنے کے بعد ہمیشہ تلف کر دیا کرو، کبھی محفوظ رکھنے کا ارادہ نہ کرنا۔

تم اپنا اور بچوں کا حال برابر لکھتے رہو تا آنکہ حالات بالکل نارمل ہو جائیں۔ آنے کا قصد نہ کرنا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

ا۔ رشید صاحب کی صاحب زادی جن کا انتقال کراچی میں ہوا۔

(۲)

۲۹ راکتوبر ۱۹۵۹ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اقبال،

تمہارا ۲۴ رکا لفافہ کل ملا۔ اس سے قبل کے خطوط نظر سے گزرتے رہے۔ اکثر سوچتا ہوں کہ جو مراحل میں نے گرتے پڑتے تقریباً ۳۵-۳۶ سال میں طے کیے تھے تم کو چند ہی سال میں طے کر ڈالنے پڑے! اب میرا کچھ اس طرح کا حال ہے کہ کسی کو صحیح مشورہ بھی نہیں دے سکتا۔ اس لیے خود مجھے اپنے طور پر بسر کی ہوئی زندگی پر اعتبار نہیں رہا۔ اس زمانے میں زندگی کا کچھ اس طرح کا حال ہے کہ رشتے ناتے اتنا کام نہیں دیتے جتنا کہ وہ حالات و حادثات جن میں کوئی شخص گھرا ہوتا ہے۔ اب کوئی ماں، باپ، بیٹا، بھائی، بہن، شوہر، بیوی چاہیں بھی کہ وہ ایک دوسرے سے عملاً محبت اور رفاقت کا تعلق رکھ سکیں تو نہیں رکھ سکتے۔ ہر شخص uprooted محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح بن پڑے اپنی پوزیشن مضبوط کرے دوسرا چاہے جنت میں جائے چاہے جہنم میں۔

دہلی میں ۱۹۴۷ء میں قیامت مچی تو مسلمان پرانے قلعہ میں اکٹھا کر دیئے گئے۔ ایک بڑے ہی معزز افسر اور ان کے بیوی بچے بھی پناہ گزین تھے۔ روٹی تقسیم ہونے لگی تو باپ نے جھپٹ کر بیٹے کے ہاتھ سے روٹی چھین لی اور کھا گیا! قلعہ کے اندر یہ حال تھا باہر کا عالم یہ تھا کہ

آٹے کی بوریاں جو پناہ گزینوں کے لیے بھیجی جاتی تھیں اس کو مسلمان باہر ہی باہر سکھوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کر دیتے تھے! وہ سکھ جو مسلمانوں کو دہلی میں قتل کر رہے تھے!!

کم و بیش یہی رنگ ہماری زندگی میں ہے ___ ایک زمانہ تھا جب لوگ قوی زیادہ ہوتے تھے، جیبیں ہلکی ہوتی تھیں۔ ایک شخص بہتوں کی صلیب اُٹھالیتا تھا۔ اب ہر اعتبار سے لوگ کمزور ہیں اس لیے اپنی ہی نہیں اُٹھا پاتے دوسرے کی کیسے اُٹھائیں! بہت سی باتوں کی وجہ سے تم سے مجھے ایک خاص طرح کی محبت ہے۔ کسی پریشانی میں دیکھتا ہوں تو کڑھتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی مصیبت کیوں پڑے، لیکن صورت یہ ہے کہ کچھ نہیں کر سکتا اور یہ معذوری مجھے اس طرح کھلتی ہے جیسے یہ مرض، یہ بڑھاپا، یہ بے روزگاری اور وہ ماحول جس میں رہنے کے لیے مجبور ہوں۔ اپنا دکھڑا سنانا بوڑھوں کو زیب نہیں دیتا اس لیے کہ انہی کا حصہ ہے لیکن تم کو تکلیف میں سن کر، دیکھ کر اپنی معذوریوں پر بے اختیار لعنت بھیجنے لگتا ہوں۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔ تمہارے خط سے وہی سلوک کیا جو تم نے بتایا تھا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۳)

جمعہ ۳۰ر جون ۱۹۶۷ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اقبال،

تمہارا ۲۰ر کا، احسان کا ۲۴ر کا اور لندن سے عذرا کا ۲۷ر کا خط مجھے ساتھ ملے۔ سب کی خیریت اور خوشی پا کر اللہ کا شکر کیا۔

احسان بالکل پا برکاب تھے لیکن ان کے visa میں کچھ گڑبڑ ہے، لکھا تھا کہ کچھ کوشش کروں۔ کر تو دی ہے لیکن کیا معلوم نتیجہ کیا ہو۔ اس لیے کہ اس طرح کی فرمائش وہاں تو کر نہیں سکتا جس کی طرف خیال جاتا ہے بلکہ معمولی لوگوں سے کہنا سنا ہے۔ کہاں اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ آئندہ ہفتے میں وہ آجائیں گے کہاں پورا پروگرام مختلف ہو گیا۔

تمہارے خط سے محسوس ہوا کہ تم Arogant ہو، ہونا بھی چاہیے اس سے آدمی کی کارکردگی اور عام well being پر بڑا خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ تمہارے دوروں سے البتہ وحشت

ہوتی ہے بالخصوص ہوائی جہاز سے لیکن کیا کیا جائے یہ سب part of the game ہے۔ کبھی کبھی بھیا کی کچھ بالواسطہ indirect خبر گیری کرلیا کرو کم سے کم جب تک عذرا اور عابد واپس نہیں آجاتے۔ سب کو دعا۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

(۴)

۲ر جولائی ۱۹۶۹ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اقبال،

مئی جون کا Perspective کل موصول ہوا۔ تمہارا مضمون بڑے غور اور شوق سے پڑھا۔ تم نے بڑی اچھی اور موزوں زبان (انگریزی) میں اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے جو اصطلاحی و علمی ہونے کے ساتھ نہایت فکر انگیز ہیں۔ تم بڑی رواں اور شستہ انگریزی لکھتے ہو اس کی بڑی خوشی ہے۔ یہ صفت آج کی نہیں ہے۔ اُس زمانے میں بھی جب تم بی اے پاس کرنے لکھنؤ گئے تھے اور انگریزی کا تمغہ ملا تھا۔ میں ماڈرن آرٹ اور مصوری سے نابلد ہوں۔ تمہارے مضمون سے جو تصاویر وابستہ ہیں وہ تو غنیمت ہیں کچھ نہ کچھ رنگ زیبائش اور تناسب ہے۔ حال میں کراچی سے غالب کی چند غزلیں ایک ڈائری کی شکل میں وہاں کے یونائیٹڈ بینک نے شائع کی ہیں۔ اس میں غالب کے بعض اشعار کو تجریدی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔[1]۔ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے وہ صرف hidous نظر آئیں۔ مصور، مصوری چاہے جتنی جانتا ہو شعر کی ہیئت و حیثیت سے بالکل ناآشنا معلوم ہوا۔ اس پر تم سے اور جلال سے کبھی زبانی گفتگو ہوگی۔ لکھنے میں بڑی طوالت ہے۔ مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ تم انگریزی بہت اچھی لکھتے ہو اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھتے ہو۔ خدا خوش رکھے۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

---

[1] الفاظ پڑھے نہ جا سکے۔

بنام

احتشام حسین صاحب

(۱)

یکم دسمبر ۱۹۵۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

احتشام صاحب محترم، آدابِ نیاز!

آپ کی نئی تصنیف سمندر و ساحل کل سُرور نے دی۔ اُسی دن اُسے باقر مہدی صاحب لے گئے۔ وہ واپس لائے تو ایک خاتون لے گئیں۔ دونوں ایسے تھے کہ انکار بن نہ پڑا۔

ایک سے آبروئے ذات خطرہ میں تھی، دوسرے سے آبروئے عشق! اب منتظر ہوں کہ واپس آجائے تو آبروئے کتاب پر ہاتھ ڈالوں۔ رعایت لفظی پر سُرور صاحب اور مولانا ماجد صاحب سے عذر خواہ ہوں۔

اُمید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب
رشید احمد صدّیقی

(۲)

۵؍دسمبر ۱۹۵۴ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

احتشام صاحب محترم، بخیر شما سلامت!!

اس دعائیہ کے کم سے کم یہ معنی تو ضرور ہوتے ہیں کہ میرے آپ کے شرّ زبان یا قلم

سے شریف لوگ کچھ دنوں محفوظ رہیں گے۔ مولانا ماجد صاحب ایسے موقع پر صرف سلام ورحمت پر اکتفا کرتے ہیں۔ ساحل وسمندر پر یہاں ڈپارٹمنٹ میں اس گفتگو سے اور ردوقدح ہوئی کہ بس اب سمجھ لیجیے کہ اس پر جو ریویو ہوا وہ طبع ہونے سے پہلے ہی شائع ہوگیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود میں نے آپ کی بڑی حمایت کی۔ کچھ سنا بھی ایسا گیا ہے کہ عورتیں معذور اور مریض کا بڑا خیال کرتی ہیں اور کہیں وہ مصنف بھی ہو تو دل وجان سے شیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ بات میں نے آپ کے چڑھانے کے لیے نہیں کہی ہے۔ سُرور صاحب کی ہمت افزائی کے لیے کہی ہے۔ ساحل وسمندر کی ابتدا میں اور آخری صفحات پڑھنے کے بعد کچھ کہنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔

بحث تو نقطۂ نظر پر کی جاسکتی ہے۔ افتادِ طبع پر کچھ کہنا بے سُود ہے۔ دل ہی عدُو ہو جائے تو پھر کیا کہیے۔ اس پر اگر کبھی گفتگو ہوسکتی تو فرصت سے اور ادبی جوت یہ کبھی میسر نہ آئے! آپ لکھتے بہت اچھا ہیں یعنی جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ نہایت ہی وضاحت اور سنجیدگی سے کہہ ڈالتے ہیں اور بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ آپ کی باتوں سے کوئی متاثر ہو یا نہیں مطمئن ضرور ہو جائے گا۔ بہر حال میں نے طے کیا ہے کہ آپ کے ساتھ امریکہ کا سفر نہ کیا جائے۔ البتہ یہ طے نہیں کرسکا ہوں کہ حرمین شریفین کی زیارت میں آپ کو ساتھ رکھوں یا سُرور صاحب کو۔ سُرور صاحب کی عاقبت درست کراتے ہوئے اور آپ کو اس لیے کہ میری عاقبت سنور جائے۔

اور ہاں کرسمس کی تہنیت قبول فرمائیے۔

کرسمس کو تیوہار نہ سمجھیے تقریبِ تہنیت سمجھیے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

بنام

ڈاکٹر احسان رشید صدیقی صاحب

(۱)

شنبہ ۱۳/۱۴ مارچ ۱۹۷۶ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

احسان،

وحید قریشی صاحب ۱۵/ مارچ کو (پرسوں) کراچی جارہے ہیں اور یہ خط لیتے جائیں گے۔ تمہاری والدہ ۱۰/ کو بمبئی سے سوا دو مہینے بعد واپس آئیں۔ بیبو کی شادی ہوگئی۔ سب کے اطمینان کے مطابق۔ تفصیلات نہ میں نے پوچھیں نہ بتائی گئیں۔ البتہ سمٰی خاصی زیر بار ہوئیں۔ شادی وغیرہ کا اب معیار ہی کچھ اس طرح کا ہوگیا ہے۔ یقین تھا کہ تمہاری والدہ بمبئی سے آتے ہی کراچی کا سفر کریں گی، لیکن کچھ تھکی ہاری تھیں اس لیے خود ہی کہا کہ اب وہ کراچی کا سفر نہ کریں گی۔ بمبئی کی زندگی، شادی بیاہ کا ہنگامہ، دوڑ دھوپ، کھانے پینے پر کوئی پرہیز نہیں۔ پھر ہوائی جہاز سے دہلی کا سفر۔ دل کے مریض کو ایسی غیر ذمہ داری کا مسلسل سوا دو ہفتے کا پروگرام کبھی نہیں رکھنا چاہیے۔ بہرحال اس کا ماتم کارِ فضول ہے۔

دو خط بھیجتا ہوں ایک سید اشفاق حسین صاحب کے نام ہے، اسے لفافہ میں بند کر کے لکھے ہوئے پتے پر بھیج دینا۔ دوسرا خط لطیف الزماں خاں صاحب کا ہے اسے پڑھ کر جواب لکھ دینا یا لکھا دینا (نیازی لکھ دیں گے) کہ جو فرمائش موصوف نے کی ہے اس سے مجھے معاف رکھا جائے۔ میری صحت ایسی نہیں رہی کہ یہ کام کرسکوں۔ ضرور کہہ دینا ورنہ معلوم نہیں کب وہ کیسے کاغذات یا مسودے بھیج دیں جو میرے لیے خلجان کا باعث ہوں۔

مجھے یونی ورسٹی میں کنووکیشن کی تقریب سے اُردو کے سلسلہ میں جن کو ڈگریاں دی جائیں گی اُن میں ایک مولانا ماجد دریابادی ہیں دوسرا میں۔ میری صحت ایسی نہیں رہی کہ میں تقریب کی آزمائش سے عہدہ برا ہوسکوں اس لیے حاضری سے معذرت کردی۔ مولانا آئے ہوئے ہیں گئے ہوں گے۔ مل گیا تو citation تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

پروفیسر شبیر خاں مکہ کانفرنس سے واپس آئے تم سے ملے بھی ہوں گے۔ تم کو دینے کے لیے میرا خط بھی لے گئے تھے۔ وہ خط پوسٹ کیا یا دست بدست دیا گیا؟ کیسی ملاقات رہی؟ یہ باتیں بتانے کی تھیں، لیکن اَب تک انہوں نے خیر خیریت کی کوئی بات کہی نہ ملنے آئے۔ میں نے بھی دریافتِ حال نہ کیا کہ ممکن ہے کوئی نزاکت ہو۔ ایسا تو نہیں کہ ملاقات سے مطمئن نہ ہوں۔ کچھ معلوم ہوا تو لکھوں گا۔

عذرا اور جلال کا خط آیا تھا۔ بہت اچھا خط۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد خوش۔ اللہ کا شکر ہے۔ عذرا کبھی دریافت کرتی رہیں کہ ان کی والدہ اقبال کے ہاں کی تقریب میں کب شریک ہونے آئیں گی تا کہ اس اعتبار سے وہ دونوں بھی آئیں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کب جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ مصر سے کوئی خط جلد سے جلد تین ہفتے سے پہلے نہیں آتا۔ ایسے میں کوئی کیا لکھے یا نہ لکھے۔ عطیہ سلمہا کا تار غالباً ۵ر کا چلا 5th March یہاں ۱۱ر یا ۱۲ر کو پہنچا جس میں انہوں نے شادی کی تاریخ لکھی تھی اور ہم سب کو مدعو کیا تھا۔ جہاں تار اتنے دن میں پہنچتا ہو وہاں خط کتابت کا کیا سوال!

اب یہاں خاصی گرمی پڑنے لگی ہے (قبل از وقت)۔ نیازی سے کہو کہ ایک کارڈ ہر دسویں دن خیریت کا بھیج دیا کریں۔ جب ایک کارڈ پر (سوا روپے کا) محصول آتا ہے تو پھر تار کے دام کیا ہوں گے۔ خط کتابت اور تار کی پہلی سی صورت ہوتی تو تم سب کی جدائی اتنی شاق نہ ہوتی۔ ہر چوتھے پانچویں خط مل جایا کرتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ تم سب کو خوش وخرم رکھے۔ یہ سب سے بڑی تلافی ہے۔

اقبال،

تم کو عطیہ سلمہا کو، تمہارے بچوں کو اور ہم سب کو یاسمین کی شادی مبارک ہو۔ عطیہ سلمہا نے اس سلسلہ میں جس محبت، شرافت اور سعادت مندی سے ہم سب کو یاد رکھا اور پہنچنے اور شریک ہونے کی مسلسل دعوت دیتی رہیں اس کا ہم سب پر خاص طور پر مجھ پر بڑا اثر ہے اور اس کے اور

اس کے متعلقین کے لیے دل سے دعا نکلتی رہتی ہے۔ آخر آخر میں اس نے تاریخ کی اور دعوت کی اطلاع تار سے دی۔ کیا کہوں رکاوٹوں سے کیسی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ ابھی مجھے تمہاری شادی اس طرح یاد ہے جیسے میرے سامنے منعقد ہو رہی ہو۔ آج تمہاری لڑکی کی شادی کی خوش خبری سن رہا ہوں۔ زندگی کا کیا عجب کرشمہ ہے!

بہر حال عطیہ سلمہا کو خاص طور پر میری دعا پہنچاؤ اور یقین دلانا کہ میں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں جیسے تم سب کے ساتھ خوشی میں شریک ہوں۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو مبارک کرے۔ آمین!

آج کنووکیشن ہو گیا۔ صحت خراب ہونے کے سبب سے شریک نہ ہو سکا۔ citation کی نقل بھیجتا ہوں۔ یاسمین سلمہا کی شادی کی پوری تفصیل نیازی لکھ دیں گے۔ اس طرح جیسے وہ کرکٹ کمنٹری کر رہے ہوں۔ مجھے اس کا بڑا انتظار رہے گا۔ نیازی لطیف الزماں خاں صاحب کو ضرور میری معذوری لکھ بھیجیں۔ عذرا اور جلال کے آئے ہوئے خطوط میں نے سلمٰی کو بمبئی بھیج دیئے ہیں۔

نیازی یا تم یا اقبال اس خط کو سامنے رکھ کر جواب لکھنا تاکہ کوئی بات چھوٹ نہ جائے۔
فیض اللہ صاحب (خویش مولانا ابو بکر صاحب مرحوم) کا مفصل خط مجھے مل گیا تھا ان کو مطلع کر دینا۔ علیحدہ خط نہ لکھ سکا۔ نیازی سے کہنا کہ اقبال اور ان کی کہنی کا کیا حال ہے اس طرف برابر جی لگا رہتا ہے۔

تمہارا

رشید احمد صدیقی

---

[1] میں نے ۲۹ رفروری ۱۹۷۶ء کو رشید صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

مصدرِ لطف و کرم، تسلیم و کورنش!

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ سب سے پہلے تو میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر احسان رشید صاحب، وائس چانسلر مقرر ہو گئے، یقین ہے کہ وہ اپنی شرافت، دیانت، حلم اور علم سے اس منصب کو بحسن و خوبی نبھائیں گے۔

مکرمی نظیر صدیقی صاحب نے آپ کی تحریروں کو جمع کیا، خیال تھا کہ ایک جلد میں یہ

سب تحریریں آجائیں گی، لیکن جب کتابت ہوئی تو اندازہ غلط نکلا۔ اب ''نقش ہائے رنگ رنگ'' دو جلدوں میں شائع ہوگی۔ پہلی جلد کی کتابت مکمل ہوگئی۔ حتی الامکان تصحیح بھی کی گئی ہے مگر کاتب نے ناطقہ بند کر دیا وہ الفاظ کے ہجے اور شکل وصورت اپنی مرضی سے بناتا ہے۔

اب ایک تصویر اور مختصر کوائف کی ضرورت ہے۔ پبلشر عزیزی محمد عمر خاں خواہش مند ہیں کہ فلیپ پر یا پھر ایک صفحہ پر تصویر اور کوائف ضرور آنے چاہئیں۔ اگر کرم فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جو طفیل صاحب مدیرِ نقوش کے ہر رُخ پر محیط ہوگی۔ وہ مصنّف بھی ہیں اور ایک معیاری رسالہ کے مدیر بھی۔ ازراہِ کرم ایک مضمون تحریر فرمایئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار یہ جرأت کی ہے کہ مضمون کے لیے زحمت دے رہا ہوں اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس ایک مضمون کے علاوہ آپ کو کبھی پریشان نہ کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی رائے بے لاگ ہوگی۔ کتاب جون تک پریس میں چلی جائے گی اس لیے مستدعی ہوں کہ مضمون اپریل تک ضرور روانہ فرما دیجیے۔

آپ کی دعاؤں کا محتاج

لطیف الزّماں خاں

یہ خط رشید صاحب کو ۱۱؍مارچ ۱۹۷۶ء کو مل گیا۔ مرحوم نے میرے خط پر لکھا ''موصولہ علی گڑھ ۱۱؍مارچ ۱۹۷۶ء'' اور اسے مرحوم احسان رشید صاحب کو بھیج دیا۔ مرحوم نظیر صدّیقی نے رشید صاحب کے مضامین دو جلدوں میں شائع کیے تھے: (۱) نقش ہائے رنگ رنگ، ۱۹۷۷ء میں اور (۲) شیرازۂ خیال ۱۹۸۲ء میں کاروانِ ادب، ملتان سے شائع ہوئی۔

عزیز دوست مرحوم محمد طفیل، مدیرِ نقوش لاہور کے لیے میں نے ایک کتاب ''محمد نقوش'' مرتب کی تھی۔ مسوّدہ طفیل صاحب سے محترم ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب لے گئے۔ ملتان ہی سے یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی لیکن بحیثیت مرتب میرا نہیں سیّد صاحب کا نام تھا۔ سیّد صاحب کے ایسے علمی کارناموں کی مختصر ترین تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: محاکمہ۔ دیوانِ غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ) مرتبہ پروفیسر جعفر بلوچ، رفاقت علی شاہد، اشاعتِ اوّل جون ۲۰۰۱ء علم وعرفان پبلشرز ۲ سی ماتھرا سٹریٹ لوئر مال روڈ، لاہور۔

◈◈◈

بنام

حکیم محمد اسلم صدّیقی صاحب[1]

(۱)

۱۸ رستمبر ۱۹۵۶ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

حضرت سلامت!

کل دہلی میں عابد صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا معجون طلب فرمایا ہے۔ آپ مرید[2] صاحب کے یہاں بھیج دیں گے تو ان کو مل جائے گا۔

البتہ ایک بات عابد صاحب نے بڑے پتے کی کہی کہ معجون کا نسخہ تو انہوں نے بتایا تھا۔ ان کو کمیشن یا رائلٹی ملنی چاہیے چہ جائیکہ آپ ان سے دام لیتے ہیں۔ میرے نزدیک تو ان کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ بہرحال اس دفعہ معجون بغیر قیمت کے جائے گا۔ شرائط وغیرہ آپ پھر طے کرلیں گے۔

آپ کا
رشید احمد صدّیقی

۱۔ حکیم محمد اسلم صدّیقی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۹ء تک دواخانہ طبیہ کالج، علی گڑھ کے منیجر رہے۔
۲۔ بشیر حسین زیدی صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے پی۔اے۔

(۲)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۸ر فروری ۱۹۶۴ء

مکرّمی، تسلیم!

مندرجہ ذیل نسخہ آپ کے پاس ہوگا۔ سات آٹھ سال پہلے استعمال میں تھا۔ آپ کا کرم یہ ہے کہ کس احتیاط و تکلف سے بنوا کر بھیج دیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے زیادہ قیمت بھی ادا کرنا گوارا تھا۔ اس زمانہ میں امراض سستے تھے دوائیں مہنگی ہوتی تھیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ طبیب مہنگے اور سب چیزیں سستی ہیں موت سمیت۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اسی نسخہ کے وہی نہیں تو اس سے بھی کم دام دوں گا جو پہلے دیا کرتا تھا۔ اس شرط پر اگر آپ اپنے دواخانہ کی شہرت آزمانا چاہتے ہیں تو دس خوراک دوا مرحمت فرمایئے یا پھر آپ نیکی کر کے دریا میں ڈالیں۔ میں شکریہ ادا کر کے دام جیب میں رکھ لوں اور دوا قبضہ میں کروں۔ لیکن پہلے مجھے دام سے مطلع فرمایئے تا کہ دیکھ لوں کہ اس دوا کے استعمال کرنے کی نیک ساعت آئی بھی ہے یا نہیں!

نیاز مند
رشید احمد صدّیقی

(۳)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۸ر فروری ۱۹۶۴ء

اسلم صاحب مکرّم، تسلیم!

۸ر یومیہ سے زائد اگر دوا پر خرچ کیے جائیں گے تو دوسری تکالیف کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے!!

آپ کے حساب سے ۱۲ر یومیہ ہوتے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدّیقی

۱۱ر فروری ۱۹۶۴ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اسلم صاحب مکرّم، سلامِ شوق!

نوازش نامہ ملا تھا، پڑھ کر بے اختیار یہ مشہور مصرع زبان پر آیا:

تو استغنیٰ ہے میرا باحسرت و یاس!

آپ نے نرخوں کے اقسام بتائے ہیں مثلاً خوردہ فروشی یا تھوک فروشی۔ یہ دونوں تو اپنی جگہ پر رہے گو یہ جب تک جوں کے توں رہیں گے میرا کام نہ بنے گا۔ ایک نرخ اور ذہن میں آتا ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر بتائیے کہ معاملہ روبراہ ہوتا ہے یا نہیں وہ نرخ ہے، ''چوری کا مال لاٹھی کا گز!''

آپ کے حساب سے رقم سات سے اوپر جاتی ہے میرے حساب سے پانچ ہوتی تو اچھا تھا اگر اس سے بھی کم نہیں!!

ان دونوں کی چول بیٹھتی ہے؟

نہیں تو پھر اس سارے قصہ کو ''مزاح المومنین'' سے زیادہ وقعت نہ دیجیے۔

آپ کا

رشید احمد صدّیقی

(۵)

۱۲ر فروری ۱۹۶۴ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم!

''کس منہہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا''!

لیکن قومی اثاثہ ماننے کے لیے آپ کی صحت اور زندگی بھی تو ضروری ہے۔ یک طرفہ ٹریفک سے کام نہ چلے گا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

دوائیں کل شام مل گئیں۔ صفائی، سلیقہ اور اہتمام ہی دیکھ کر ان کا اثر محسوس کرنے لگا۔ یقین ہے کہ دس خوراک تیس خوراک کا کام دے گی۔ آپ کے خلوص اور میری شکر گزاری کا یہ

کرشمہ ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۶)

۴؍مارچ ۱۹۶۴ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اسلم صاحب مکرّم، تسلیم!

میری بہو (احسان کی بیوی) پاکستان سے آئی ہوئی ہے۔ اہلیہ نے کچھ بیویوں کو اس سے ملانے کے لیے کل پانچ کو جمعرات ساڑھے چار بجے دن مدعو کیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں بیگم اسلم صاحبہ کو بھی تکلیف دوں۔ امید ہے آپ ہم دونوں کی درخواست پہنچا دیں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۷)

۱۳؍اگست ۱۹۶۴ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم!

آپ نے میرا پرانا نسخہ بڑی کفایت سے بنوا دیا تھا۔ مزید کفایت کی صورت میں نے یہ نکالی کہ آپ نے دس دن کی دوا دی تھی میں نے اسے دو مہینے چلایا۔ پھر ایک بات کا اور انکشاف کیا یعنی اس میں سب سے موثر دوا شربتِ انار تھی، لیکن سفوف میں ملا کر چاٹنے سے نہیں بلکہ توس پر لگا کر کھانے سے۔

اب ارادہ ہے کہ صرف شربتِ انار کا استعمال کیا جائے۔ دوا کے طور پر نہیں غذا کے طور پر۔ دریافت کرنا یہ ہے کہ کسی دوا کا مصرف بدل دینے سے قیمت پر کیا اثر پڑتا ہے! بجلی کے بارے میں تو معلوم ہے کہ پنکھا، ہیٹر اور روشنی کے لیے ۱۵ فی یونٹ ہوتی ہے لیکن اگر انجن چلایا جائے اور

زیادہ مقدار میں کسی کارخانہ میں لی جائے تو پانچ پیسے کر دیتے ہیں۔ شربتِ انار پر بھی یہ رعایت لاگو ہے یا نہیں؟ کیا یہ شربتِ انار صرف دوا کے مصرف کا ہوتا ہے یا معمولاً شربت وغیرہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے؟ بالفاظِ دیگر انار کے علاوہ اس میں کوئی دوا بھی ملی ہوتی ہے یا نہیں؟ یوں شربتِ انار کا نرخ کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ ایک بوتل گنّے کے رس کا سرکہ درکار ہے بازار میں بالعموم گنّے کے رس کا نہیں ملتا۔ ایسڈ آمیز ہوتا ہے وہ نہیں چاہیے۔ یقین ہے آپ کے یہاں اصلی سرکہ ہوگا۔ خالی بوتل بھیجتا ہوں تاکہ بوتل کا دام وضع ہو جائے۔ قیمت ملازم ادا کر دے گا۔ امید ہے مزاج مع الخیر ہوگا۔

نیازمند

رشید احمد صدیقی

(۸)

۲۷/اکتوبر ۱۹۶۵ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

(بحوالہ گفتگوئے دیروز)

مجی، تسلیم!

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ مسئلہ خاص کے بارے میں صاحب معلوم سے میں براہِ راست گفتگو کروں گا۔ کسی اور کو بیچ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس گفتگو میں آپ کا حوالہ آئے یا نہیں۔ میرا تو خیال ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ ایسے معاملے میں یکسر غائب بازی کھیلنا درست بھی نہیں۔ جیسی مرضی ہو مطلع فرمایئے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۹)

۱۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم!

''فتوحات''یا''عطیات''موصول ہوئیں۔

عمرت دراز باد، زمانت بساز باد!

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۱۰)

۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

اسلم صاحب مکرم، تسلیم!

خالص زعفران ایک عزیز کو بطور تحفہ دینا ہے۔ سنتا ہوں یہ شے (خالص) کشمیر میں بھی نہیں ملتی۔ تین چار مہینے ہوئے دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ آپ کے اسٹاک میں ہے۔ کیا نرخ ہے؟ نرخ پر مدار ہے اپنی خریداری کی توانائی کے اظہار کا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

بنام

سیّد اشفاق حسین صاحب

(۱)

شنبہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء

ذاکر باغ،
علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مجی و مکرمی، تسلیم!

۲۷ رفروری کا گرامی نامہ کل ۱۲ رمارچ کو موصول ہوا۔ ترجمان القرآن کے بارے میں میری معلومات ناکافی ہیں اس لیے میں نے آپ کا زیر نظر خط اپنے ایک مکرم دوست مالک رام صاحب کو دہلی بھیج دیا ہے۔ موصوف کا بڑا قریبی تعلق ساہتیہ اکیڈمی سے ہے اردو کے مستند اسکالر ہیں۔ مولانا آزاد مرحوم کی تصانیف کا تمام تر کام اکیڈمی کی طرف سے مالک رام صاحب ہی نے انجام دیا ہے۔ ان کی یاد اللہ مرکزی حکومت کے اعیان و اکابر سے ہے۔ موصوف جو کچھ لکھ بھیجیں گے وہ میں آپ کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔

ترجمان القرآن کے بھیجنے کا بھی موصوف ہی کی معرفت انتظام ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔

سب سے زیادہ تعجب اور افسوس بھی اس کا ہے کہ جو دو واقعے پنڈت جی اور نوازش صاحب کے میں نے لکھے تھے اس سے تمام تر آپ کی تعریف مقصود تھی نہ کہ تنقیص جس کی جواب دہی میں آپ کو تصنیف لکھنی پڑی۔ اتنا تو خیال فرمایا ہوتا کہ اس میں آپ کی تنقیص کا شائبہ بھی ہوتا تو میں کیوں لکھتا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔

سید بشیر الدین صاحب سابق لائبریرین کو اس سال پدم شری کا خطاب ملا ہے۔ خوش ہیں۔ میں نے ان کا پتہ آپ کو اور آپ کا پتہ ان کو لکھ دیا تھا۔ مسز حیدر کو بھی۔ مسز حیدر نے بتایا کہ کسی دوسرے پتہ پر آپ کو وہ متعدد خطوط لکھ چکی تھیں لیکن کسی کی رسید نہ آئی۔ ممکن ہے اب ان کا

خط آپ کو ملا ہو۔

یہ خط احسان کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ایک صاحب ۱۰؍مارچ کو جانے والے ہیں وہ لیتے جائیں گے۔ اس طرح یہ آپ کو جلد مل سکے گا۔

دُعا ہے آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

To.
Syed Ashfaq Hussain. Bar at Law.
Spencer's Building. Melcod Road.
Karachi.

بنام

ایڈیٹر سلیمان ہال میگزین

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

(۱)

۸؍جنوری ۱۹۷۲ء

ذاکر باغ،
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیزم!

آپ نے اپنے اُردو میگزین کے لیے ایک پیغام کی فرمائش کی تھی۔ تعمیل میں یہ چند سطور ارسال ہیں۔ اس طرح کی طلب و تعمیل کے اتفاقات اکثر پیش آتے رہے ہیں۔ اتنے آپ کو نہیں، جتنے مجھے۔ البتہ کبھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ ''غریبِ شہر'' پیغام کا انجام کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ پیغام نہیں درخواست یہ ہے کہ جو باتیں آپ کی فرمائش پر آپ ہی کے لیے کہی جائیں ان پر عمل نہیں تو کبھی کبھی ان پر غور کر لیا کیجیے۔ غور کرنے اور عمل کرنے کے درمیان فاصلہ بہت کم بھی ہوتا ہے اور بہت زیادہ بھی۔ کیا عجب آپ کا حوصلہ اس فاصلے کو کم ہی نہیں بلکہ ختم کر دے۔

آپ نے اثنائے گفتگو میں بتایا تھا کہ آپ اور آپ کے ہم خیال احباب سلیمان ہال ایک اُردو میگزین نکالنا چاہتے ہیں۔ اس سے دل خوش ہوا۔ آپ اور آپ کے بیشتر رفقا سائنس اور ٹیکنالوجی کے طالب علم ہیں لیکن اُردو شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ بڑی اُمید افزا بات ہے۔ آج کل اچھے لوگوں کے سامنے اس صورتِ حال نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی ہے۔ انسانیت کی دنیا بڑی تیزی سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات اور کرامات کے سامنے پسپا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جس سے زندگی ایک عالمگیر ہراس، ہلچل اور بے یقینی کا شکار ہے۔ نوجوان جو اس صورتِ حال کو بہتر بنا سکتے تھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کا شکار ہیں۔ یہ بڑی ہی تشویش کی بات ہے۔ چاہتا ہوں کہ موجودہ اراکین سلیمان ہال اس تشویش اور تلخی کو جو طرح طرح

سے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں سرایت کرگئی ہے اس کو دُور کرنے کی کوشش کریں اور اخلاق و مذہب سائنس ٹیکنالوجی کے تفرقات میں توازن اور توافق پیدا کریں اس کا مطلق خیال نہ کریں کہ اتنا بڑا کام اتنے چھوٹے پیمانے پر اپنے محدود ذرائع اور وسائل سے کس طرح شروع کیا جاسکتا ہے اور کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اچھے کام کو مشکل یا معمولی سمجھ کر نہ کرنا اور بُرے کام کو آسان اور نفع بخش جان کر کرنا اور کرتے رہنا بڑی ناسمجھی بلکہ بزدلی کی بات ہے جو کسی طرح نوجوانوں کو زیب نہیں دیتی خاص طور پر آپ علی گڑھ کے طالب علموں کو۔ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کاموں کو شروع کرنے اور کامیاب بنانے والے اکثر و بیشتر شخص اور فرد ہوا کیے ہیں۔ جماعتیں اور ادارے بعد کی باتیں ہیں۔ آپ کا یہ میگزین ممکن ہے زیادہ دن نہ چل سکے لیکن اس اچھے کام کو شروع کرنے اور اس کو شوق اور محنت سے کچھ دن چلاتے رہنے کی یاد آپ سب کے دلوں کو تا دیر گرماتی، گدگداتی اور اچھے سے اچھے کاموں کو کرنے کا شوق اور حوصلہ دلاتی رہے گی۔

اُردو ہندوستان کی طبعی، تاریخی اور اخلاقی تقاضوں کا بڑا حیرت انگیز قیمتی اور بے مثال امتزاج یا کشید ہے۔ تاریخِ یادداشت میں کسی سرزمین نے شاید ہی ایسا کوئی گراں قدر اور نمائندہ نقشِ بدیع چھوڑا ہوا ہو جیسا اُردو کی شکل میں ہندوستان نے پیش کیا ہے۔ علی گڑھ نے اس اُردو کی کیسی بیش قرار خدمات انجام دی ہیں وہ آپ کو معلوم ہیں۔ اس طرح جو ذمہ داری ہندوستان اُردو اور علی گڑھ کی طرف سے آپ پر عائد ہوتی ہے وہ بھی محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ۵

آپ نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ صاحب باغ کی تاریخ اور اس میں رہنے بسنے والے ناموروں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤں۔ بتانے کو تو بہت کچھ ہے لیکن اس میں طوالت ہے اور خطرہ بھی۔ اسلاف کے کارناموں پر اکتفاء کر کے ہم نے بڑا نقصان اُٹھایا ہے۔ ایک ناقابلِ تلافی نقصان۔ اب اس تفریح سے تائب ہو جایئے اور یہ لطیفہ یاد رکھیے، ایک نامور خاندان کے برخود غلط فرد نے ایک ایسے شخص سے جو خاندانی افتخار کی رُو سے فروتر تھا غرور اور طنز سے اس کا حسب و نسب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا ''آپ کا حسب نسب آج ختم ہوگیا۔ میرا آج سے شروع ہوتا ہے۔'' تو آپ صاحب باغ کی ناموری اور ناموروں پر نہ جائیں اپنے کارناموں سے آج سے اس پر اضافہ کرنا شروع کردیں خدا اس کی توفیق دے۔ آمین!

مخلص

رشید احمد صدیقی

بنام

جنابِ ایڈیٹر "فروغِ اُردو" لکھنؤ

(۱)

Muslim University, Aligarh.

۲۷ مئی ۱۹۳۶ء

مخدوم و محترم،

ناگ پور کی اجلاس کی کارروائی کا مطبوعہ پمفلٹ ابھی ابھی موصول ہوا۔ اس سے قبل میں اسے مورخہ ۲۶ مئی "ملت" دہلی میں تمام کا تمام دیکھ چکا تھا۔ گزشتہ سال دہلی میں پرشوتم داس ٹنڈن نے مجھ سے اسی قسم کی گفتگو کی تھی۔ بہرحال یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا غم و غصہ اور پھر چپکے بیٹھ رہنا یا اس کا منتظر رہنا کہ "پردۂ غیب سے" کیا ظاہر ہوتا ہے بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مسلمانوں کے اس قسم کے زویّہ سے آپ مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہیں۔ بہرحال اس قسم کے ماتم سے نہ پہلے کچھ ہوا اور نہ اب ہوگا۔ میں بذاتہٖ اس کا منتظر ہوں کہ آپ کیا تدابیر تجویز فرماتے ہیں۔ میرے ذہن میں کچھ باتیں آتی ہیں جن میں چند تو غم و غصہ کی بنا پر ہیں اور بعض ایسی ہیں جو سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی جا سکتی ہیں اور مفید طلب ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ سارے ہندوستان میں اُردو یوم منایا جائے اور آپ کے مطبوعہ پمفلٹ کے جستہ جستہ اقتباسات پوسٹر کی ہیئت سے شائع کیے جائیں۔ بالخصوص گاندھی جی کا وہ فقرہ یعنی اُردو قرآن کی زبان میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان پادشاہوں نے اسے پھیلایا۔ آپ کا مطبوعہ پمفلٹ ہر اجلاس میں پڑھا جائے وغیرہ۔

۲۔ مسلمان اُردو پریس متفقہ طور پر اس صورتِ حال کا نوٹس لے اُردو ادیب اور شعرا کو بھی ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے اپنے رنگ میں اس صورتِ حال اور طریقۂ کار کا نوٹس لیں۔

۳۔ نہایت منظم طور پر ایک سرمایہ کھولا جائے اور ہر مسلمان کو مجبور کیا جائے کہ اس

میں کچھ نہ کچھ ضرور چندہ دے۔ سرمایہ کئی لاکھ کا ہونا چاہیے اور اس کو اپنے طور پر صرف کیا جائے۔ ایسے جس طور پر سُوراج کا سرمایہ خرچ ہوتا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں، ہر قسم کی اسکیم اور ہر قسم کی مطبوعات جو اس سلسلہ میں مفید اور مناسب ہوں انہیں پر یہ سرمایہ صرف کیا جائے۔

۴۔ سارے ہندوستان میں اُردو کی اشاعت اور تحفظ کے لیے مقامی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کی پوری طور پر نگرانی کی جائے اور ان کی پوری طور پر مدد کی جائے۔

۵۔ دلّی، یا کہیں اور اس کا ماہانہ اجلاس ہونا چاہیے جہاں اس سلسلہ میں مسلمانوں کا مستقل اور متعین رویہ طے پائے۔ ہندو قوم ایسی نہیں ہے جو ذرہ برابر بھی sportsmanspirit سے متاثر ہوتی ہو۔ صلح جوئی یا مفاہمہ کو قطعاً خیر باد کہا جائے اور قطعی طور پر یہ رویہ اختیار کیا جائے کہ اُردو کی اشاعت اور اس کا تحفظ خالص مذہبی اور تمدنی فریضہ ہے جس کو مسلمان کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کریں گے۔

۶۔ مسلمانوں کے مقتدر اور سنجیدہ افراد خواہ ان کی زندگی کا مشغلہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس سلسلہ میں منسلک کیے جائیں اور اس مسئلہ کو ایسی اہمیت دی جائے کہ ہندو یہ سمجھ لیں کہ مسلمانوں نے اسے قومی مسئلہ بنالیا ہے۔ اس کو وہی اہمیت دی جائے جو کبھی تحریکِ خلافت کو تھی یا مسلم یونی ورسٹی کی اسکیم کو حاصل تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میری بعض تجاویز کو محض جوش اور غصہ پر محمول کر کے طفلانہ خیال کریں گے لیکن مجھے کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی تحریک کو عالمگیر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو بے تکا بھی رکھا جائے۔ سوراج کے سلسلہ میں چرخا کاتنا اسی سلسلہ میں تھا۔ اسکیم کی کامیابی کا مدار محض اصلاحی مساعی پر نہیں ہوتا بلکہ کسی حد تک بے مدار stunts پر بھی ہوتا ہے۔ گاندھی جی کی فاقہ کشی بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہوتی ہے۔

یونی ورسٹی میں تعطیل ہو چکی ہے۔ وسط جولائی میں طالب علموں کا ہجوم ہوگا۔ مجھ سے اس وقت جو کچھ ہو سکے گا میں تو کروں گا ہی لیکن میری خواہش ہے کہ آپ خود تشریف لاتے اور اس سلسلہ میں کچھ فرماتے۔ مسلم یونی ورسٹی کے طلبا میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ان کو بیدار کرنے اور صحیح راستے پر لگانے کی ضرورت ہے۔ جو چیز بیرونِ علی گڑھ پچیس سال میں ترقی کر سکتی ہے اگر وہ مناسب طریقہ پر علی گڑھ کے طلبا میں پیدا کر دی جائے تو پانچ سال میں اتنی ہی ترقی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ترقی نسبتاً زیادہ پائیدار اور مستقل ہوگی۔ جہاں تک اُردو کی اشاعت و تحفظ کا تعلق ہے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی گڑھ کے طلبا کے ساتھ ساتھ ایک

جماعت اساتذہ بھی آپ کے ساتھ ہوگی۔ آپ جو رقم علی گڑھ کے لیے مقرر کریں گے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے فراہم کرادوں گا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کو بعض سہولتیں ایسی حاصل ہیں جو دوسرے مقامات کو نہیں ہیں۔ علی گڑھ کا ساتھ آپ کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ کچھ اور نہیں تو تبلیغی حیثیت مسلم ہے۔ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ ہندوؤں سے آئندہ جب اور جس قسم کا مفاہمہ کیا جائے اُردو کا تحفظ اور اس کی اہمیت شرطِ اوّل قرار دی جائے۔

معاف فرمائیے گا اس وقت شام کو آپ کا مطبوعہ پمفلٹ پہنچا اور میں فوراً ہی اس عریضہ کو مرتب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ خیالات وغیرہ میں بے ربطی پائی جائے تو اس کا لحاظ نہ فرمائیے گا۔ میں نے صرف یہ چاہا ہے کہ کسی طور پر آپ میرے اور ضمناً علی گڑھ کے جذبات سے آگاہ ہو جائیں۔

مجھے اُمید ہے آپ مجھے اُردو کا ادنیٰ خدمت گار تصور فرمائیں گے اور اس سلسلہ میں مجھے یا علی گڑھ کو جس خدمت کا اہل تصور فرمائیں اس سے مطلع فرمائیں گے۔

خادم

رشید احمد صدیقی

(۲)

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مکرمی، تسلیم!

گرامی نامہ ملا۔ جاں نثار اختر نمبر نکالنے کی خوش خبری موصول ہوئی۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار کی خدمت میں تہنیت پیش کرتا ہوں کہ آپ اتنا اچھا کام ایسی خوشی اور بلند حوصلگی سے انجام دینا چاہتے ہیں۔

جاں نثار اختر صاحب کی خدمت میں سلامِ شوق پہنچائیے۔

مخلص

رشید احمد

◈◈◈

بنام

پطرس بخاری صاحب

(۱)

ایک مرتبہ میں نے خط لکھا کہ کچھ روپے بھیج دیجیے، کارِ خیر کے لیے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دیے توقع سے زائد، میں نے شکریہ کے خط میں لکھا:

''میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مطبع مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا۔ اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا۔ مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے، چنانچہ عذاب واپس لے لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر بھیجی ہے وہ آپ کے اَب تک کے گناہوں کے لیے ایسی ہی ثابت ہوگی۔''

پطرس بخاری نے لکھا مژدہ کا شکریہ لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو شرح مبادلۂ زر ''اتنا خاطر خواہ'' نہ ہے۔۔۔۔

(ماخوذ از ہم نفسانِ رفتہ)

بنام

تسکین قریشی صاحب

(۱)

۷ر جنوری ۱۹۵۰ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

تسکین صاحب محترم آداب۔

کل گرامی نامہ صادر ہوا۔ میرے ''مخدومی'' لکھنے کا آپ نے گلہ کیا ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں اس کا تعلق میری عادت سے ہے، اخلاق سے نہیں۔ شکایت تو آپ کو میرے اخلاق سے تھی عادت سے تو نہیں؟ غالباً وہ اَب دُور ہو جائے گی۔

اس سے قبل کے صفحات پرسوں بذریعہ رجسٹری بھیج چکا ہوں۔ بقیہ یہ ہیں۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ مسوّدے کی نقل میرے پاس نہیں ہے اس لیے اگر یہ کتابت سے پہلے تلف ہو گیا تو آپ کے لیے اس کا فراہم کرنا ناممکن ہوگا۔ ممکن ہو تو احتیاط رکھیے گا۔

غالباً میں آپ کو مطلع کر چکا ہوں کہ جگر صاحب کا کلام اب نام کا محتاج نہیں رہا جو جی چاہے رکھ لیجیے۔ کوئی فرق نہ پڑے گا۔ یہ تو آج کل کے معمولی شعراء اور مصنّفین ہیں جو اس کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ پھر بھی آپ نے جو دو نام بھیجے ہیں، یعنی ''آتشِ گل'' اور ''برقِ ایمن'' ان میں سے مجھے ''برقِ ایمن'' زیادہ پسند ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ پسند ہے۔

یہ بات بھی میں ظاہر کر چکا ہوں کہ اس مضمون میں ترمیم، اضافہ، حذف، اصلاح سب کا آپ کو اختیار ہے۔ آپ جگر صاحب اور نُبر ور صاحب جو چیز چاہیں رکھیں جو نہ چاہیں نہ رکھیں۔

میری رائے لینے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ہاں اس کا منتظر رہوں گا کہ یہ مسوّدات آپ تک پہنچ گئے یا نہیں۔

خیر طلب
رشید احمد صدّیقی

(۲)

۲۹ر جنوری ۱۹۵۰ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مکرّمی، تسلیم

آپ کے ۹ر جنوری کے خط کا جواب غالباً میں دے چکا ہوں جس میں آپ نے مقدمہ کے ایک جز کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اسے حذف کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ آپ بے تکلف اسے حذف کر دیں۔ سُرور صاحب کو اس کا عنوان پسند نہ آیا۔

انہیں سے اصرار کیجیے کہ وہ عنوان تجویز کر دیں یا آپ خود کچھ لکھ دیجیے۔ ایسے معاملات میں مجھے کچھ اصرار نہیں ہوتا۔ وہ تحریر بھیج چکا تو مسوّدہ میں پہلا صفحہ نظر آیا۔ شبہ یہ ہوا کہ کہیں پہلا صفحہ کہیں یہیں تو نہیں رہ گیا۔ سُرور صاحب کو لکھ دیا تھا معلوم نہیں انہوں نے اس کی تصدیق کر لی یا نہیں کہ پہلا صفحہ آپ کو دوسرے صفحات کے ساتھ موصول ہوا یا نہیں۔ مضمون کی ابتدا ہوتی ہے اس فقرہ سے۔

''غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔۔۔۔''

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک جملے میں میں نے غالباً ''خدوخال'' لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ''خط وخال'' ہونا چاہیے۔ بہرحال دیکھ لیجیے گا۔

میں ۲۸ر کو آنے والا تھا لیکن بوجوہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ ورنہ گفتگو ہو کر یہ باتیں طے ہو جاتیں۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار
رشید احمد صدّیقی

۸رفروری ۱۹۵۰ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، آداب۔

آپ کے دو عنایت نامے ملے۔ میں جواب نہ دے سکا۔ معاف فرمائیے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ کاٹ چھانٹ کر دی۔ آپ یقین جانیے کہ مجھے اس کی خوشی ہے۔ کبھی ملاقات ہوئی تو زبان سے بھی اپنے اطمینان اور خوشی کا اظہار کروں گا۔ ایک خط سرور صاحب کا بھی آیا ہے۔ جس میں اور امور کا تذکرہ ہے۔ اگر ملاقات ہو تو کہہ دیجیے گا کہ اس خط کا جواب میرے ذمہ ہے۔ جلد دوں گا۔ ہو سکا تو جلد ہی۔

مذہب و اخلاق کے بعض نکتے جو آپ نے بیان کیے ہیں ان کا میں احترام کرتا ہوں۔ ان کا ہی نہیں آپ کا بھی۔ موقع ہوا تو اس پر گفتگو ہوگی زبانی ورنہ تحریری۔

سُرور صاحب کی خدمت میں سلامِ مسنون پہنچا دیجیے گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۴)

۲۰رجنوری ۱۹۵۴ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

جناب قریشی صاحب مکرّم، آداب نیاز۔

آپ کے دو گرامی نامے صادر ہوئے اور آپ کے کلام کے مجموعہ ''گلگونہ'' کا بھی ایک نسخہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی اور عزت افزائی کا احسان مند ہوں۔ آپ نے فرمائش کی ہے کہ آپ کے کلام پر میں بھی کچھ عرض کروں۔ مجھے کچھ عذر بھی نہ ہوتا لیکن گلگونہ کے تعارف میں جو باتیں جس شرافت اور سلیقے سے جگر صاحب، اثر صاحب اور سُرور صاحب لکھ گئے ہیں اس کے بعد میرا کچھ لکھنا یوں بے کار ہے اور بے محل بھی کہ میں ان پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کو ''اکابر'' کی تحسین جمع کرنے کا بھی شوق نہیں ہے اور آپ اُن معقول آدمیوں میں ہیں جو اپنے کارناموں کی تحسین خود دے اور لے سکتے ہیں اور جب اس

منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو اپنے علاوہ سب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ خدا کرے اب تک آپ نہ پہنچے ہوں تو اب پہنچ جائیں۔ لیکن میں نے یہ بات آپ کے لیے کہی ہے سب کے لیے نہیں۔ ورنہ میرے اس بیان کو ہر ''برخود غلط'' اپنے لیے سندِ جواز سمجھ لے گا۔

آپ کے خطوط میرے سامنے نہیں ہیں اس لیے آپ کا پتہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ مکتبہ جامعہ کے پتہ سے اس خط کو بھیجتا ہوں۔ اگر آپ تک نہ پہنچا تو نہ پہنچے۔ مجھے تو ثواب مل ہی جائے گا۔ خدا حافظ۔

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

(۵)

۷/دسمبر ۱۹۶۲ء

ذکاءاللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، سلامِ مسنون۔

عنایت نامہ صادر ہوا۔ خوش ہوں کہ ذاکر صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی اور مقصد بر آری کی صورت نکل آئی۔ اب اس کام کا انصرام ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کے ہاتھوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھے ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے ہم کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔

ایک ضروری بات یہ عرض کرنی تھی کہ مجھے اس کام میں نہ ڈالیے۔ نہ اس تقریب کے افتتاح کے سلسلے میں، نہ یہاں نہ کہیں اور۔ میں ہر اعتبار سے معذور ہوں۔ افتتاح وغیرہ کی رسم ادا کرنے کے لیے کسی اور کو منتخب فرمائیے۔ یہ اس لیے عرض کرنا پڑ گیا کہ پچھلے دنوں لائبریری میں آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا تو آپ نے تقریب کی ایک رسم میرے سپرد کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ میں نے اس وقت اپنی معذوری کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں کسی حال میں کہیں پیش پیش رہنا نہیں چاہتا۔ کسر نفسی کی وجہ سے نہیں۔ جسمانی اور ذہنی معذوری کے سبب سے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم

میں نے جگر صاحب مرحوم کی ڈگری[۱] کے لیے رجسٹرار صاحب سے عرض کیا تھا۔ ان کا جواب آ گیا کہ محترمہ بیگم جگر متصل تحصیل گونڈہ۔ گونڈہ کے پتہ پر ڈگری بھیج دی جائے گی۔ مجھے یہی پتہ یاد تھا۔ غلط تو نہیں ہے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[۱] جگر صاحب مرحوم کو مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی لیکن اعلان ہونے کے بعد جب دو سال گزر گئے اور ڈگری باقاعدہ طور پر بیگم جگر کو نہیں بھیجی گئی تو تسکین قریشی صاحب نے رشید صاحب سے تحریک کی کہ وہ کچھ سلسلۂ جنبانی فرمائیں۔

(۷)

جمعہ ۲۵ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم۔

نوازش نامہ صادر ہوا۔ ''فکر و نظر'' میں انشاء اللہ ''متاعِ تسکین''[۲] پر ریویو ہو جائے گا لیکن اگلی سہ ماہی میں۔ موجودہ رسالہ دو تین ہفتہ میں نکل آئے گا اس لیے اس میں گنجائش نہیں رہی۔ ریویو کے سیکشن کے جو صاحب انچارج ہیں انہوں نے یہی بتایا، میرا تعلق فکر و نظر سے براہِ راست نہیں۔ ایک طور پر اخلاقاً وابستہ کر دیا گیا ہوں۔ اس لیے اس کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن کوشش کروں گا ریویو جلد ہی شائع ہو جائے۔ جگر صاحب مرحوم کے کلام کے بارے میں آپ نے جن مختلف حضرات کے فرمودات کا ذکر کیا ہے ان سب سے اتفاق ہے لیکن اس میں کون مقدم ہے کون موخر اور کس کا بیان کلیتہً صحیح ہے، یہ میں بالکل نہیں بتا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ واقعات اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے وقت پر پیش ضرور آئے اس زمانے میں ان کا چرچا رہا

کرتا تھا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی دلچسپی نہ تھی اور جگر صاحب نے اس بارے میں مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس لیے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ انتخاب و اشاعت کے سلسلہ میں جگر صاحب کو کبھی کبھی آزردہ یا برہم ضرور پایا لیکن یہ بہت عرصے کی بات ہے۔ ایک صاحب نے حال ہی میں لکھنؤ سے کچھ اس طرح کی باتیں دریافت کی تھیں۔ میں نے آپ سے رجوع کرنے کا مشورہ دے دیا تھا۔

رجسٹرار صاحب کے دفتر سے کل اطلاع ملی کہ مرحوم کی آنریری ڈگری بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیج دی گئی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

۱ تسکین قریشی صاحب کا مجموعۂ کلام۔

(۸)

۳۰ رجنوری ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی، آداب۔

تہنیت نامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ یہ خط نہ لکھتے جب بھی یہ یقین تھا کہ آپ کو میری اس عزت افزائی سے کتنی خوشی ہوگی۔

تسکین صاحب اب میرا جی ریویو، تبصرہ وغیرہ لکھنے کا بالکل نہیں چاہتا۔ میں اس وادی کا امام بھی نہیں ہوں نہ کبھی رہا۔ ایسا ہی مجبور ہو جاتا ہوں تو بہت بادلِ ناخواستہ کچھ نہ کچھ لکھ دیتا ہوں۔ "فکر و نظر" کے تبصرہ کے سیکشن کے جو انچارج ہیں وہ "ماہرِ فن" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کی چیزیں انہیں کے سپرد کی جاتی ہیں۔

بیگم اصغر مرحوم کی شدید علالت کا بڑا رنج ہے۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے۔ آمین۔

دعا گو

رشید احمد صدیقی

(۹)

۲؍فروری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم۔

نوازش نامہ مرقومہ ۳۱؍جنوری کل صادر ہوا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ڈگری پہنچ گئی۔ بار بار ذاکر صاحب کو یاد دلانے سے آپ احتیاط کرتے ہیں، مناسب ہے وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ البتہ اس کا یقین ہے کہ موصوف کو یاد رہا تو وہ یونی ورسٹی کے اربابِ اختیار سے ضرور دو چار کلماتِ خیر فرمادیں گے۔

"جگر کارنر" کی جو تجویز آپ کی ہے اس کا انصرام تمام تر وائس چانسلر صاحب کی صواب دید پر منحصر ہے اور میری رسائی وہاں تک نہیں ہے۔ بفرضِ محال ہوئی بھی تو شنوائی نہ ہوگی۔ بڑے آدمی صرف بڑے آدمیوں کی باتیں درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدّیقی

(۱۰)

۷؍فروری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم۔

ذاکر صاحب کو آج یاد دہانی لکھ بھیجی ہے لیکن سوچتا رہتا ہوں کہ موصوف اور وائس چانسلر صاحب کا "قران السعدین" کیسے اور کب ہوگا اور ملاقات کے وقت یہ بات یاد بھی رہے گی یا نہیں۔

بہر حال تعمیلِ ارشاد کر دی گئی۔

دعا گو
رشید احمد صدّیقی

(۱۱)

پرسنل

۹؍مارچ ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

تسکین صاحب مکرّم، سلامِ شوق۔

نامۂ گرامی ملا اور ذاکر صاحب کے نام کی نظم بھی۔ تقاضے کا انجام کچھ بھی ہو، صورتِ حال نے آپ سے ایک اچھی نظم لکھوالی۔ میرا تو خیال ہے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں کہ آپ نے اس طور پر یاددہانی کا ایک موقع نکالا۔ غالبؔ نے تو یہاں تک جرأت کی تھی

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

"فکر ونظر" کے حالیہ شمارے میں "متاعِ تسکین" پر تبصرہ شائع ہوگیا۔ کارکنانِ رسالہ کو آپ کی فرمائش لکھ بھیجی ہے۔ دیکھیے کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے تعمیل کریں۔ میرے کہنے کی نہیں آپ کی فرمائش کی۔

مخلص

رشید احمد صدّیقی

(۱۲)

پرسنل

۲۵؍مارچ ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبی، تسلیم۔

والا نامہ مورخہ ۱۳؍مارچ کو پہنچا۔ گوشۂ جگر کے بارے میں صورتِ حال معلوم ہوئی۔ جامعہ اور مسلم یونی ورسٹی دونوں کے "حکام عالی مقام" باوجود اس ہدایت یا اشارت کے جو اُن کو ذاکر صاحب سے ملی آمادۂ کار نہیں ہوئے تو ہم آپ کر کچھ نہیں سکتے ماتم چاہے جتنا کرلیں۔ یہاں کے اُردو ڈپارٹمنٹ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ صدرِ شعبہ سے بھی تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ملنا جلنا درکنار ایک طرح "صاحب سلامت" بھی بند ہے۔ یونی ورسٹی میں اب میری کوئی ایسی حیثیت نہیں رہی جسے لوگ کسی طرح قابلِ اعتناء سمجھیں۔ اس لیے میرے کہنے سننے کی کوئی

وقعت نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جگر صاحب مرحوم کی یادگار اشیاء آپ کچھ دنوں اپنے ہی قبضہ میں رہنے دیں اور ہم دونوں انتظار کریں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں اس بارے میں فضلی صاحب[1] کے کہے پر عمل کیا جائے۔

موصوف ہم دونوں سے بہتر پوزیشن میں ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ وہ کوئی معقول راہ نکال دیں جو یہاں ناممکن سی معلوم ہونے لگی ہے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] فضل احمد کریم فضلی، پاکستان کے مشہور شاعر۔

(۱۳)

۱۵؍جون ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،

مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

تسکین صاحب مکرم، تسلیم۔

۱۲؍جون کا گرامی نامہ کل صادر ہوا۔ اچھا اور ضروری کام ہو سکے تو جلد سے جلد کر ڈالنا چاہیے۔ چاہے عمر کم ہو یا زیادہ۔ فریضے کی ادائیگی سے ذہن پر سے بوجھ اُتر جاتا ہے جس سے عمر کی کمی بیشی کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی وقت مجیب صاحب کو یاددہانی کا خط بھیج چکے ہیں تو اب خط و کتابت نہ کیجیے۔ مالک رام صاحب کو میں خوب جانتا ہوں اور عرصہ سے یاد اللہ ہے بندھے ٹکے عقائد سے قطع نظر شرافت اور وضع داری میں وہ ہم ایسے بہت سے مسلمانوں سے بہتر انسان ہیں۔ اگر آپ مرحوم کی یادگار چیزیں ان کے حوالہ کر دیں گے تو مجھے یقین ہے وہ ان کا ہم بہتوں سے زیادہ احترام کریں گے اور محفوظ رکھیں گے۔

اصغر صاحب مرحوم کی مطلقہ بیوی کی رحلت کی خبر سن کر تکلیف ہوئی۔ مجھے اصغر صاحب اور جگر صاحب مرحومین کی خانگی زندگی کا مطلق علم نہیں لیکن مرحومہ کی رحلت کی خبر سن کر اصغر صاحب یاد آ گئے اور ان کے ساتھ جو یادیں وابستہ تھیں وہ بھی تازہ ہو گئیں اور بڑی محرومی محسوس ہوئی مگر ان باتوں سے کیا ہوتا ہے جو ہونے والا تھا وہ ہو چکا اور جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہمارے

رنج والم سے کیا ہوتا ہے۔
اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدّیقی

(۱۴)

Strictly Personal

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۸ر جون ۱۹۶۳ء

محترمی، تسلیم۔

۱۵ر کا گرامی نامہ کل صادر ہوا۔ جگر صاحب کی یادگار قائم کرنے کی آپ تنِ تنہا کتنی اور کتنے دنوں سے کوشش کر رہے ہیں اور کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کا خیال کرتا ہوں تو طبیعت بڑی مکدر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک بار عرض کیا تھا کہ مرحوم کی یادگار (چیزوں) کو اپنے ہی پاس رکھیے۔ ممکن ہے کچھ دنوں بعد خاطر خواہ کوئی صورت نکل آئے۔ آپ کی ہر کوشش کو ناکام سن کر مجھے مرحوم کی یاد کی توہین محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے چاہتا تھا کہ اس تحریک کو کچھ دنوں التواء میں رکھا جائے۔

تسکین صاحب، یقیناً آپ مجھ سے سمجھ دار اور دنیا دیکھے ہوئے ہیں۔ میں تو تمام عمر یونی ورسٹی کے گنبد سے باہر نہ نکلا لیکن جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اپنے بیوی بچے نہیں خیال کرتے تا بدیگراں چہ رسد! دنیا کا یہی شیوہ ہے اور ٹھیک ہے۔ مرنے والے کی یاد مناتے اور یادگار بناتے رہیں تو دنیا رہنے کی جگہ نہ رہ جائے۔ اس لیے قانونِ قدرت کا احترام کرنا چاہیے۔ جگر صاحب کو زندہ رہنا ہے تو وہ اپنے کلام میں رہیں گے۔ ہم آپ یا ان کی عینک بٹوہ کب تک رکھیں گے۔ میری تلخ نوائی کو معاف کیجیے آپ کی ہمدردی میں یہ کلمات زبان پر آ گئے۔

مخلص
رشید احمد صدّیقی

(۱۵)

Personal

۱۲؍جولائی ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، سلام نیاز۔

کل شام گرامی نامہ ملا۔ یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا اور خوشی بھی کہ جگر صاحب مرحوم کے تبرکات کو جامعہ میں محفوظ کرنے کا انتظام حسب دل خواہ ہو گیا۔ دراصل مجھ کو اس کی اور زیادہ خوشی ہے کہ آپ کو اس طرف سے دل جمعی نصیب ہوئی۔ کبھی ہو سکے تو جامعہ جا کر مجیب صاحب سے مل لیجیے اور موصوف سے اصرار کیجیے کہ وہ ذاکر صاحب کو رسمِ افتتاح ادا کرنے کے لیے رضامند کر لیں۔ ذاکر صاحب حال ہی میں جامعہ کے امیر منتخب ہوئے ہیں اگر نائب امیر جامعہ یعنی مجیب صاحب تحریک کر دیں گے تو ذاکر صاحب زیادہ آسانی سے اس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے میرا کہنا مناسب نہ ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۱۶)

پرسنل

۱۱؍ستمبر ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محبِ محترم، سلامِ شوق۔

نامۂ گرامی مورخہ ۷؍کل شام موصول ہوا۔ میرٹھ سے اتنی دیر میں کبھی کوئی خط نہیں موصول ہوا تھا۔ جامعہ میں گوشۂ جگر کے بعنوان شائستہ اور حسب دل خواہ قائم ہونے کی خبر سن کر خوش ہوا کون نہ ہوگا؟ یہ تمام تر آپ کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے سوا کوئی اور اس کام کو اس خوش اُسلوبی سے (لیکن کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھانے کے بعد) اتمام کو نہ پہنچا سکتا۔ ہم سب آپ کے شکرگزار ہیں اور آپ کو تہنیت پیش کرتے ہیں۔ دنیا کا کارخانہ بھی عجیب ہے۔ اپنی حیات میں جگر صاحب جہاں کہیں تشریف لے جاتے محبت اور عقیدت میں ایک خلقت ٹوٹ

پڑتی۔ آج ان کی ایک معمولی سی یادگار قائم کرنے میں آپ کو کیا کیا نہ جھیلنا پڑا۔ شاید آرزو لکھنوی نے نور جہاں کا مزار دیکھ کر کہا تھا

جس پر مرنے والے لاکھوں تھے
اس پر رونے والا کوئی نہیں

مشیت الٰہی یوں ہی ہے۔ اس لیے ٹھیک ہے۔ مجھے نہ دعوت نامہ ملا نہ اطلاع، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آدمی کو آب و دانہ یا خاکِ گور کھینچتی پھرتی ہے۔ میرے لیے دونوں یہیں مقدر ہو چکے ہیں اس لیے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔

سید صدیق حسن صاحب ممبر بورڈ آف ریونیو لکھنؤ کی اچانک وفات سے کیسا صدمہ ہوا۔ جگر صاحب کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۱۷)

پرسنل

۱۴ر ستمبر ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی، آداب۔

گرامی نامہ کل شام صادر ہوا۔ یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اس تقریب سے حسب دل خواہ عہدہ برآ ہوئے۔ میں نے اس کا ذکر اپنے خط میں کر کے۔۔۔ صاحب کو بھیج دیا ہے اور یہ بھی عرض کر دیا ہے کہ خود آپ بہت مسرور و مطمئن ہیں کہ یہ تقریب ممدوح کے ہاتھوں اس خوش اُسلوبی سے انجام کو پہنچی۔

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی مع الخیر ہوگا۔ معلومہ تقریر کہیں نہ کہیں، پڑھنے کو مل جائے گی۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

(۱۸)

پرسنل

۲۰ ر ستمبر ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، تسلیم۔

والا نامہ مورخہ ۱۱ ر ستمبر ابھی ابھی صادر ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ جگر صاحب مرحوم کے کلام کی طباعت کا انتظام وانصرام ''مکتبہ جامعہ لمیٹڈ'' کے سپرد کر دیا کئی سال ہوئے میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ جعلی ایڈیشن مسلسل دہلی میں چھپنے لگے تھے۔ میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ تاباں صاحب منیجر مکتبہ نے مشورہ دیا کہ اگر طباعت کے حقوق مکتبہ کو دے دیئے جائیں تو ان جعلی اشاعتوں کا سدِ باب ہو جائے گا۔

جگر صاحب مرحوم کے مزار کے جنگلے[1] کے لیے زمین حاصل کرنے میں آپ کو جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان سے تکلیف ہوئی لیکن جو مسلمان اس کام میں حائل ہو رہا ہے وہ میرے لیے بالکل تعجب کی بات نہیں ہے۔ میں نے ان بزرگ سے بھی گئے گزرے اور قابلِ نفرت مسلمان دیکھے ہیں۔ بہر حال ایسوں پر لعنت بھیجئے۔ ان کے ذکر سے طبیعت بڑی منقبض ہوتی ہے۔ میرے نزدیک بہتر یہ ہوگا کہ آپ گونڈہ جائیں اور وہاں کے اکابر مسلمان ہندو شہریوں اور حکومت کے ذمہ دار عہدہ داروں سے اس معاملہ پر گفتگو فرمائیں۔ یقیناً وہاں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو اس دشواری میں آپ کی مدد کریں گے۔ وہ آدمی لالچی ہے، ایسا کیجیے کہ اس کو کچھ اور روپے مل جائیں اور اکابر کی بات خالی نہ جائے اس طرح مفاہمت کی گفتگو میں آسانی ہوگی اور انشاء اللہ مقصد برآری بھی ہو جائے گی۔

نیاز مند
رشید احمد صدیقی

---

[1] جگر صاحب کا مزار بحسن وخوبی تعمیر ہو چکا ہے۔

(۱۹)

پرسنل

۲۵ر ستمبر ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، سلامِ شوق۔

۲۴ر کا گرامی نامہ ملا۔ خوش ہوں کہ جس کام میں اتنے دنوں سے آپ کا دل لگا ہوا تھا۔ وہ خدا کے فضل سے خیر و خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا۔ مبارک ہو۔۔۔۔ صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے لیکن جب کبھی لکھتا ہوں آپ کا اور آپ کی مہم کا ذکر کر دیتا ہوں۔

تسکین صاحب میں بوڑھے سے بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا۔ اللہ نے فراغت بھی دی لیکن روپے کا حساب رکھنا اور سمجھنا کبھی نہ آیا۔ روپے میں کماؤں خرچ دوسرے کریں اور اس کا حساب رکھیں یا نہیں۔ تمام زندگی یہی دستور رہا۔ اس لیے جگر صاحب کی کتابوں کی آمدنی کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ البتہ اتنا یقین دلاتا ہوں کہ اس آمدنی کو بڑے محفوظ ہاتھوں میں دیکھتا ہوں اور کلیتہً مطمئن ہوں۔ اس معاملے میں آپ ''خزانے کے سانپ'' کے لیے بھی باعثِ رشک ہیں البتہ۔۔۔ (دو لفظ پڑھے نہیں جاتے)

ایک بات عرض کروں گا تا کہ جہاں تک ممکن ہو جس کا حق ہو روپیہ، روپیہ براہِ راست اسی کو دیا جائے روپیہ پیسہ کے معاملے میں Middle Man کا میں قائل نہیں۔ آپ کے نیاز صاحب[1] کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں، کیا ہیں اور کیسے ہیں اور ان کو براہِ راست روپیہ ادا کرنا محفوظ طریقۂ کار ہے یا نہیں۔ یقین ہے آپ نے اپنا اطمینان کر لیا ہوگا۔

دعا گو

رشید احمد صدیقی

---

[1] نیاز احمد (علیگ) مرحوم جگر صاحب کے سالے کے لڑکے ہیں، بیگم جگر انہی کے پاس انہی کے مکان میں رہتی تھیں۔

(۲۰)

۲/اکتوبر ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، آداب۔

عنایت نامہ مورخہ ۲۹/ستمبر کل شام صادر ہوا۔ آپ نے جگر صاحب کے وقف نامے کے مطابق سارے انتظامات کردیے اور مرحوم کی یادگار قائم کرنے کا جو منصوبہ تھا وہ بھی پورا کردکھایا۔ خدا مبارک کرے اور جزائے خیر دے۔ آمین!

بمبئی کے جن صاحب کی بے التفاتی کا آپ نے شکوہ کیا ہے ان کے بارے میں میرا تجربہ بھی ایسا ہی ہے لیکن میں نے اس طرح کی باتیں اعزا و احباب اور دوسروں میں اس کثرت سے دیکھی اور سُنی ہیں کہ اب ان کا اثر زیادہ نہیں ہوتا۔ زندگی کے کتنے دن رہ گئے ہیں کہ اس طرح کی مکروہات کا ماتم کیا جائے۔ یا مسرّتوں کی خواہش کروں بس خدا کرے کہ اس طرح کی حرکت کرنے کی خود کو نہ خواہش ہو نہ جرأت۔ میرے لیے اتنا کافی ہے۔

ایک نہایت ضروری امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کچھ دن ہوئے میں نے ہندوستان اور پاکستان کے رسائل اور اخبارات کے ذریعہ احباب، اعزا اور بزرگوں سے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ان کے خطوط کبھی شائع نہ فرمائے جائیں بلکہ بہ نظر احتیاط ان کو تلف کردیا جایا کرے۔ دوسرے یہ کہ میرے مرنے پر نہ کوئی یادگار قائم کی جائے نہ چندہ کیا جائے نہ رسائل کا کوئی نمبر نکالا جائے۔ نظر برآں آپ سے استدعا ہے کہ میرے خطوط پڑھنے کے بعد فوراً تلف فرما دیا کیجیے۔ شکرگزار ہوں گا۔ آپ کے نام میرے جملہ خطوط پرسنل ہوتے ہیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

(۲۱)

۹/اکتوبر ۱۹۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

تسکین صاحب محترم، آداب۔

محبت نامہ کل شام صادر ہوا۔ میرے خطوط شائع ہونے نہ ہونے کے بارے میں آپ

نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہیں۔ بایں ہمہ اپنی خواہش کو ایک درخواست کی شکل میں پیش کر دینا چاہتا تھا کہ شاید اس کا اچھا اثر ہو۔ ورنہ کون کس کا ہاتھ پکڑ سکا ہے کہ یہ کر دیا وہ نہ کرو۔ دراصل میں کسی طرح نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد میری یادگار منانے یا بنانے میں عزیزوں اور دوستوں کو کسی طرح کی زحمت اُٹھانی پڑے، جس طرح جگر صاحب مرحوم کے سلسلے میں آپ کو اُٹھانی پڑی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو انتہائی خلوص و محبت سے خط لکھے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ اپنی نہاد کے اعتبار سے وہ نہایت درجہ فرومایہ ہیں۔ اس لیے نہیں چاہتا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ میں ایسے نالائقوں کو اتنا اچھا سمجھتا تھا۔ لیکن کیا کیجیے۔ اب تو تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے۔ تسکین صاحب، جگر صاحب مرحوم کی یادگار کو آگے بڑھانے میں اب زیادہ مضطرب نہ ہوجیے۔ کسی کی یادگار بندے نہیں قائم کرتے۔ خدا بھی کرتا ہے۔ ہم سے جو ہو سکتا تھا اور جتنا ہو سکتا تھا، ہم نے کیا۔ اب دیکھیے خدا کیا کرتا ہے۔ آدمی کے حقوق آدمی پر ہی نہیں خدا پر بھی ہوتے ہیں۔ اس بھید کو نظر انداز نہ کیجیے۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

رشید احمد صدیقی

بنام

جمیل اختر خان صاحب

(۱)

۲؍اپریل ۱۹۷۱ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، سلامِ مسنون۔

گرامی نامہ صادر ہوا۔ اس پر ایک صحبت میں یہاں اچھی طرح گفتگو ہوئی۔ اس طرح کے مسائل میں ہمارے ہاں کے مشہور فاضل مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی (ریڈر شعبہ فارسی، مسلم یونی ورسٹی) کا قول اکثر و بیشتر قولِ فیصل تسلیم کیا جاتا ہے وہ ذیل میں درج ہے۔ اگر اس سے آپ کو اتفاق ہو یا کوئی دوسری صورت ہو تو آپ براہِ راست موصوف سے رجوع فرمائیں اور شکریے کا خط بھی تحریر فرمادیں۔ اس طرح کی دشواریاں آپ عرشی صاحب سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ جو آپ سے بہت قریب ہیں اور غالب پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ ضیاء احمد صاحب نے شعر کے معنی جو لکھے ہیں ''تماشائے ادا نگاہ کی صنعت مرکب ہے، تماشا فارسی میں نظارہ نیز ہنگامہ کے معنی میں آتا ہے، یعنی ایسی نگاہ جس کی ادا قابلِ دید ہو یا جس کی ادا ہنگامہ بدوش ہو۔ نگاہ بھی معشوق کی ہے اور دل بھی اسی کا۔ میں ''دل سے ترے'' پڑھتا ہوں ''تری'' نہیں۔ چوں کہ ہر فعل کا اصل محرک دل مانا گیا ہے اس سے نگاہ کا مرکز بھی دل سے ہے ''سرمہ سا'' کی رعایت سے خموشی لائے ہیں۔ اس پر بظاہر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ سرمہ لگانے سے خموشی کا کیا تعلق؟ سرمہ کھانے سے خموشی یا آواز بند ہونا تو صحیح ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ آنکھ یا نگاہ واقعی سرمہ کھاتی ہے اور سرمہ کھانے کا اثر یقیناً خاموشی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان سرمہ لگاتا ہے اور

آنکھ سرمہ کھاتی ہے۔ اس طول کلام کے بعد شعر کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ تیرے دل سے جو نگاہ نکلتی ہے وہ سرمہ سا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ خاموشی کے باوجود اس کی ہر ادا اپنے اندر ہزاروں ہنگامے رکھتی ہے (جن کی وجہ سے عشاق پر قیامت آ جائے تو کیا عجب) یہ صحیح ہے کہ دل پر سرمہ کہاں سے آیا مگر شاعر نے دو چیزوں کا مشاہدہ کیا اوّل نگاہ کا خاموش ہونا یا دوسرے تماشا ادا ہونا۔ ان سے یہ نتیجہ نکلا کہ یقیناً سرمہ کھایا ہوگا جس کا یہ اثر ہے۔

خیر طلب

رشید احمد صدّیقی

بنام

خلیق احمد نظامی صاحب

(۱)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

نظامی صاحب مکرم، آداب۔

جائزہ والا رسالہ میرے سامنے ہے۔ اس سے میں ضرور استفادہ کروں گا لیکن اس کام کو ہوئے ۷-۸ سال ہوئے۔ اس دوران میں اگر کوئی اور اہم بات ہوئی ہو جس کی طرف آپ کے نزدیک ہم سب کو توجہ کرنی چاہیے تو براہِ کرم ان کو نوٹ کر کے بھیج دیں تاکہ میں ایڈریس میں شامل کرلوں۔ اس کے علاوہ اس صوبے سے متعلق اگر کچھ ضروری باتیں ایسی ہوں جن کی طرف حکومت یا قوم کو متوجہ کرنا ہو ضروری ہو یا آپ مناسب سمجھتے ہوں کہ ان کا اظہار ضروری ہو تو براہِ کرم فوراً لکھ بھیجئے۔ میں آپ کا شکرگزار رہوں گا۔

خاکسار
رشید احمد صدیقی

بنام

رحم الہاشمی صاحب

(۱)

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۳/نومبر ۱۹۵۷ء

مخدومی!

ہم رشتہ کارڈ ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں تو اس پر بحث ہو چکی۔ آپ کے قولِ فیصل کا انتظار ہے۔ تکلیف دہی کی معافی کا خواستگار۔

شعر زیرِ بحث یہ ہے:

ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ
رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۲)

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی، سلامِ نیاز۔

آپ نے یہ شعر فی الفور تصنیف فرما دیا تھا یا کسی اور کا ہے جسے آپ نے موقع پر چسپاں کیا؟ بہر حال کچھ ہی ہو، میں آپ کے اس کو برمحل پیش کرنے پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

شاید ہی کوئی اور اس سے زیادہ موزوں شعر اس محل پر پیش کر سکتا تھا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱؎ رحم الہاشمی صاحب ایک دن رشید صاحب سے ملنے گئے۔ ملازم نے جو انہیں پہچانتا نہ تھا کہہ دیا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک پرچے پر حافظ کا شعر لکھ دیا اور کہا کہ جب وہ آئیں تو اُن کو دے دے۔ وہ واپس ہو رہے تھے کہ ملازم نے وہ پرچہ جا کر رشید صاحب کو (جو گھر میں موجود تھے) دکھایا۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور ملازم کی حرکت پر معذرت خواہ ہوئے۔ شعر یہ تھا:

مُردم ز انتظار و دریں پردہ راہ نیست
یا ہست و پردہ دار فشانم نمی دہد

(۳)

۳۰ ستمبر ۱۹۵۸ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدوم و محترم، سلامِ مسنون۔

ابھی ابھی ایک معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ دو سال کے لیے آپ شعبہ فارسیہ کے چیئرمین اور پروفیسر مقرر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ یہ آپ کا حق تھا جو آپ تک بالآخر پہنچا۔ میری طرف سے دلی تہنیت قبول فرمائیے۔ دُعا ہے کہ آپ اس کی ذمہ داریوں سے بہ وجوہ احسن عہدہ برآ ہوں۔ آمین

اُمید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

(۴)

۱۰ فروری ۱۹۵۹ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی!

یہ میرے ایک ساتھ کے پڑھے ہوئے دوست کا کلام ہے۔۔۔ انہوں نے خواہش

ظاہر کی ہے کہ کوئی صاحب فن ان اشعار کو دیکھ لے اور اصلاح دے دے۔ تا کہ کہیں کوئی سقم نہ رہ جائے اور کلام چست ہو جائے تو نورٌ علیٰ نور۔ درخواست ہے کہ آپ اسے ایک نظر ملاحظہ فرمالیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ یہ کام اور اس طرح کا کام اس وقت یونی ورسٹی میں آپ کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

بنام

روش صدیقی صاحب

(۱)

۱۸ر فروری ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدوم و محترم، آداب!

آج کے اسٹیٹسمین سے یہ معلوم کر کے مسرور و مفتخر ہوا کہ حکومت نے آں جناب کے لیے وظیفہ مقرر فرمایا ہے۔ تہنیت کا ہدیہ محقر قبول فرمایئے۔

آپ کے فضل و کمال کے اعتبار سے یہ رقم کوئی حقیقت نہیں رکھتی لیکن اعزاز کی بات یہ ہے کہ آپ کی فضیلت و شخصیت کا اعتراف کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔

نیاز مند
رشید احمد صدیقی

◈◈◈

بنام

رئیس امروہوی صاحب

مکرمی،

جن اشعار پر نشان لگائے تھے ان کا حوالہ درج ذیل ہے اور اشعار بھی بہت اچھے ہیں کارڈ میں اتنے ہی کی گنجائش ہے اس لیے انہی پر اکتفا کرتا ہوں حصہ منظومات میں چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ کے بارے میں چاہتا ہوں کہ کبھی اتفاق ہو تو زبانی گفتگو کروں تحریر میں بڑی دیر لگتی ہے اور بحث بھی تشنہ رہ جاتی ہے لیکن زبانی گفتگو کا موقع شاید کبھی نہ آئے اس لیے مجبوری ہے اشارۃً عرض کر سکتا ہوں کہ منظومات کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن کی خاطر خواہ داد آپ کو چالیس سال سے کم عمر کے ناظرین سے ملے گی اور یہ بھی کوئی کم امتیاز نہیں ایک شاعری نوجوانوں کے لیے بھی تو ہوتی ہے۔ حسب ذیل شعر بہت پسند آئے

قلزم بے کنار جلوۂ و رنگ
دیدۂ ضوفشاں میں ڈوب گیا

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں

نوکِ ہر خار وخس ہے خون آلود
روحِ صحرا برہنہ پا تو نہیں

(رشید احمد صدیقی)

بنام

والدہ ساجدا ے زاہد صاحب

(۱)

۱۶رنومبر ۱۹۵۷ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمہ بیگم صاحبہ، سلامِ مسنون!

خدا آپ کی مدد فرمائے اور اس جاں کاہ صدمے میں راضی بہ رضائے الٰہی ہونے کی سکت اور سعادت عطا فرمائے۔ آمین! کون اندازہ کرسکتا ہے آپ کے صدمے کا! مرحوم کا جن لوگوں سے تھوڑے دنوں کا بھی سابقہ رہا وہ بھی اُن کی شرافت اور لیاقت کے تمام عمر قائل رہے چہ جائے کہ آپ جن کا مرحوم سے تمام عمر ساتھ رہا۔

مرحوم کا میں طالب علم رہ چکا ہوں۔ مرحوم اس یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر تشریف لائے اور کیسا پُر آشوب زمانہ تھا۔ گو مجھے اُن کے ساتھ اور اُن کے سایۂ شفقت میں کام کرنے کی عزت اور فخر حاصل ہوا۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ جب بھی پاکستان سے علی گڑھ تشریف لاتے غریب خانے پر مجھے نوازنے ضرور تشریف لاتے۔ مرحوم کے اُٹھ جانے سے وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں جو مرحوم کی یاد کو میرے لیے بڑی مبارک اور مسرت بخش بناتی تھیں۔

اس موقع پر مجھ سے کچھ اور بَن نہیں پڑتا سوا اس کے کہ مرحوم کی مغفرت کی صمیمِ قلب سے دُعا مانگوں اور آپ سے درخواست کروں بڑے ادب اور اخلاص سے کہ صبر سے کام لیں اور اُن کی تقویت کا باعث بنیں جو آپ سے تقویت پانے کے منتظر اور مستحق ہوں۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

بنام

بیگم سلمیٰ شان الحق

(۱)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۰؍جنوری ۱۹۵۰ء

عزیزہ،

آپ کا خط ملا۔ خوش ہوا۔ خدا آپ کو سب کو کامیاب اور کامران رکھے۔ شان الحق کہاں اور کس حال میں ہیں۔ یہاں جن لوگوں کو آپ دونوں یاد ہیں وہ سب آپ کا تذکرہ محبت سے کرتے ہیں۔

مسز حیدر کو میں نے آپ کی ضروریات لکھ کر بھیج دی ہیں۔ اکیڈمک کونسل میں کل ملاقات ہوگی تو زبانی بھی عرض معروض کروں گا۔ اُمید تو ہے کہ کامیابی ہوگی۔

سلمیٰ اور عذرا، دونوں اَب دو بچوں کی مائیں ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر دونوں نے آپ کو بڑے لُطف سے یاد کیا۔

شان الحق کے ادبی مشاغل جاری ہیں یا نہیں؟ آپ دونوں اس مشغلہ کو جاری رکھیں۔ بڑے فائدہ میں رہیں گی۔ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ پیشہ کے علاوہ یا پیشہ ہوتے ہوئے بھی بہت مبارک تفریح ہے جو مرتے دم تک آدمی کو سہارا دیئے رہتی ہے۔ یہ چیز کبھی باسی یا بوسیدہ نہیں ہوتی۔ ہماری عورتوں کو خاص طور پر اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ خدا حافظ۔

خیر طلب
رشید صدیقی

اور ہاں یادش بخیر سلیمٰی سلطانی!؟

بنام

شان الحق حقی صاحب

(۱)

۳۰ راگست ۱۹۵۸ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیز گرامی، دُعا!

ماہِ نو میں ''آشفتہ بیانی'' پر آپ کا ریویو دیکھ کر شکر گزار ہوا اور ''تارِ پیراہن'' کے مطالعہ سے جی خوش ہوا۔ اگر آپ اپنے کو اپنی ہی نظرِ بد سے محفوظ رکھ سکے تو اُردو شعر و ادب کے خدمت گزاروں کے حلقے میں آپ کا نام جلد ہی بڑی محبت اور عزت سے لیا جانے لگے گا۔ اگر لیا جانا شروع نہیں ہو گیا ہے! اسے اُتنی دُعا نہ سمجھئے گا جتنی پیشین گوئی۔ دُعا اس لیے نہیں کہ دُعا کا کیا نہ مقبول ہوئی تو کوئی کیا کرے گا، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اس پیشین گوئی میں دُعا مضمر ہے!

سلمٰی اور بچے کو دُعا۔

خیر طلب
رشید صدیقی

بنام

صہبا لکھنوی صاحب

(ایڈیٹر "افکار" کراچی)

(۱)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۱۱ رمئی ۱۹۵۰ء

جوبلی کی تقریب ایک خاص مدت تک زندہ رہ چکنے کا اعلان نہیں ہے۔ کسی شخص یا ادارے کی جوبلی منائے جانے کا اگر کوئی صالح اور معقول مفہوم ہوسکتا ہے تو یہی کہ اس کی خدمات اور فتوحات کا جائزہ لیا جائے۔ اس کی قدر و قیمت متعین کی جائے اور مستقبل میں اس کی ذات سے مزید سعادتوں کی توقعات وابستہ کی جائیں۔ ورنہ کسی تودۂ خاک کو محض قوالی کے شور و غوغا سے زیارت گاہ میں نہیں تبدیل کیا جا سکتا!

حفیظ نے جن جدت سامانیوں اور ندرت طرازیوں کے ساتھ شعر و سخن کی محفل میں قدم رکھا، نظم کی مختلف اصناف فنِ ابداع سے کام لیا، پھر اُن کے شاعرانہ اجتہادات کو جو قبولِ عام نصیب ہوا اور اپنے ہم عصروں اور پیش رووں کو اُنہوں نے جس طور سے اور جس حد تک متاثر کیا یہ سب باتیں ایک مبارک و کامراں ادبی داستان کے مختلف ٹکڑے ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ یہ خوش طالعی حفیظ کے ماحول اور زمانہ کے کسی دوسرے شاعر کے حصہ میں بہت کم آئی۔

حفیظ نے جوش، اختر شیرانی اور دوسرے ہم عصر شعراء کے ساتھ اُردو نظم کو اُن جدید رجحانات اور نئے اسالیب سے آشنا کیا جنہوں نے موجودہ دَور میں زیادہ واضح اور نمایاں شکلیں اختیار کیں۔ اس طرح وہ جوش و اختر شیرانی کے ساتھ اُردو کی جدید ترین شاعری کے پیشرو قرار

پاتے ہیں۔ اس کی تفصیل اُردو شاعری کے مورخ اور نقاد کا کام ہے، لیکن اتنی بات بہر نوع مسلّم ہے کہ حفیظ نے اپنی منظری اور محاکاتی نظموں، اپنی غزلوں کی تاثیر اور سریلے پن اپنی گیتوں کی مٹھاس اور بحور و قوافی کے سلسلہ میں اپنی دلکش جدتوں سے اُردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور بڑی حد تک متنوع بنایا۔

اُردو شعر و ادب کو لکھنؤ اور دلّی کی گرفت سے آزاد کرانے میں علی گڑھ نے حالؔی سے جو کام لیا وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ اس کے بعد اُردو شاعری نے جس ہمہ جہت ترقی کا ثبوت دیا وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ حالؔی کا مسدس پنجاب میں اقبالؔ اور حفیظؔ کی ملّی شاعری کا جس رنگ و آہنگ سے محرک ہوا اور موخرالذکر دونوں نے حالؔی کے نقطۂ نظر کو اپنے اپنے طور پر جس طرح فروغ دیا ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مطالعہ ہے۔ اقبالؔ کے کارناموں سے قطع نظر حفیظؔ کے شاہنامہ اسلام کو ایک زمانہ مین ایسا فروغ ہوا کہ کوئی محفل میلاد ایسی نہ ہوتی جہاں شاہنامہ اسلام انتہائی شوق و عقیدت سے پڑھا یا سُنا نہ جاتا۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں شاہنامہ اسلام کا یہ قبولِ عام حفیظؔ کی شاعری کا خاصا بڑا کارنامہ تھا۔

میں اس جوبلی کو حفیظ کی خدمات کا بڑا مبارک اعتراف اعلان سمجھتا ہوں، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ وہ شاعر کوئی بڑا شاعر نہیں جو صرف اپنے جمع کیے ہوئے سرمایہ پر بقیہ زندگی بسر کرنے لگے خواہ وہ ذخیرہ کتنا ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہوں۔ شاعر وہی ہے جو اپنے نت نئے کارنامہ میں زندہ رہ سکے۔ حفیظؔ کو اس کے مواقع ہیں۔ ایسے مواقع جو شاید اُن کو پہلے کبھی نصیب نہ تھے۔ میں بڑے تردّد آمیز شوق سے یہ دیکھتا رہوں گا کہ حفیظؔ کیا کرتے ہیں! خدا اُن کے شوق اور حوصلہ کو بڑھائے۔

اس اعتبار سے اور اس کی خاطر اُن کی زندگی کو میں آزمائش سے بچنے کی دُعا نہیں کر سکتا آزمائش سے عہدہ برا ہونے کا حوصلہ پیدا ہونے کی دُعا بڑے شوق سے مانگتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

درج بالا خط ''افکار'' کراچی کے ''حفیظ نمبر'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

بنام

صغیر صاحب

(۱)

۲۲ را پریل

شعبۂ اُردو،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

صغیر صاحب مکرم!

میں مولانا احسن صاحب کے ساتھ نواب صاحب قبلہ سے قبل مغرب نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

براہِ کرم اس کا انتظام فرما دیجیے اور مجھے وقت سے مطلع کیجیے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

◈◈◈

بنام

عابد علی خان صاحب[1]

(۱)

شنبہ ۴ر اگست ۱۹۷۴ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مشفقی و مکرمی، تسلیم۔

فرمائش کی تعمیل ضرور کرتا لیکن ان دنوں طرح طرح کی تکالیف اور معذوریوں کا ایسا غلبہ ہے کہ کچھ کر نہیں پاتا، معافی کا خواستگار ہوں۔ سیاست کی سلور جوبلی ضرور منایئے اور میری طرف سے بیش از بیش تبریک و تہنیت قبول فرمایئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سیاست بطور خود ہما شما کی ستائش و نوازش سے بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ زیرِ نظر تقریب کو مبارک فرمائے۔ آمین!

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] عابد علی خاں مرحوم، روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے بانی۔

◈◈◈

بنام

قاضی عبدالودود صاحب

(۱)

۱۰ اردسمبر ۱۹۴۰ء

انجمن ترقی اُردو (ہند)
۱۔دریا گنج، دہلی

مشفق بندہ، تسلیم!

آپ کا رجسٹرڈ خط جناب مولوی صاحب کے نام وصول ہوا۔ صاحب موصوف یہاں تشریف نہیں رکھتے۔ آپ کا خط اُن کی واپسی پر اُن کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

۱۔ دیوانِ جوشش کی کاپیوں کی وصولی کی اطلاع دے چکا ہوں۔ حسبِ ہدایت والا تصحیح کروا رہا ہوں، اطمینان فرمایئے۔ اگر اس کے متعلق مزید کچھ لکھنا ہو تو لکھ بھیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کی تکمیل ہوگئی اور کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو پروف آپ کی خدمت میں بھجوادوں گا تصحیح میں اپنے سامنے کروا رہا ہوں۔

۲۔ تذکرہ میر حسن کے متعلق یہ گزارش ہے کہ اگر پیش لفظ میں جو مولوی صاحب کی طرف سے اس میں مقدمے سے پہلے لگایا جا رہا ہے صرف آپ کے اشارات ۔۔۔ وغیرہ (جن کے متعلق پہلے لکھ چکا ہوں) کی تشریح کردی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ ضروری ہے۔ جناب مولوی صاحب سے بھی مشورت کرلوں گا۔ سابق مقدمے کی کتابت ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ جناب مولوی صاحب کے پیش لفظ کی بھی جس میں انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ آپ مقدمہ لکھنے والے تھے لیکن علالت کے سبب نہ لکھ سکے۔ خدا کا شکر ہے اب آپ کی صحت اچھی ہے۔

میں ستمبر بھر بیمار رہا۔ یہی وجہ ہوئی کہ دفتر والوں نے غلطی سے دیوانِ جوشش کی کاپیاں جناب مولوی صاحب کے پاس بھیج دیں اور اتنا عرصہ اُن کے پاس پڑی رہیں۔ آپ کو جو زحمت ہوئی اُس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

نیازمند

رشید احمد صدیقی

یہ خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ (میرے نام) پہنچا۔ آپ کے مسوّدے میں ترتیب حسب ذیل ہے:

۱۔	سرورق	۱
۲۔	فہرست مضامین	۲
۳۔	عرضِ حال	۳
۴۔	مقدمہ	۷-۳۵
۵۔	تصانیف	۳۶-۴۶
۶۔	حواشی وغیرہ	۴۷-۴۹
۷۔	دیوان	
۸۔	ضمیمہ	
۹۔	غلط نامہ	
۱۰۔	مزید اغلاط	
۱۱۔	اشارات وتحقیقات	

براہِ کرم دیوانِ جوشش کا بقیہ مسوّدہ اور سرورق کا مسوّدہ نیز تذکرہ میرحسن کا سرورق کا مسوّدہ اور ن۔م۔نم کی تشریح جلد ارسال فرمایئے۔ غلط نامے میں جو چیزیں بڑھانے کے لیے آپ نے لکھا ہے وہ میں بڑھادوں گا۔ اطمینان فرمایئے۔

صفحہ ۴۹ کی آخری تین سطریں:

دولفظوں کے درمیان ہندوستانی حرف عطف اور بموجب بھی یہ دونوں مل کر مضاف ہو سکتے ہیں: نام اور نشان قلعہ ۲۳۴، اب یہ جائز نہیں، جہاں یہ یا کی کا وغیرہ چاہیے وہاں بھی اضافت سے کام لیتے ہیں۔

نہیں دولتِ مہجوری		زرد و سپید آنکھیں	
دست اندازِ چراغ	۱۷۷	پس و پیشِ امتحاں	۱۰۰

◈◈◈

بنام

سیّد علی احسن صاحب مارہروی

(۱)

۱۳ر جولائی

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی،

کارواں (لاہور) کا خط آیا ہے، انہوں نے آپ کی نظم کے بارے میں شفاعت چاہی ہے۔ براہِ کرم اپنی ایک بڑھیا سی غزل کارواں میں طبع ہونے کے لیے بھیج دیجیے اور ایک غزل اس مصرعہ طرح کے سلسلہ میں

دیوانہ کر دیا مجھے دیوانہ کردیا

اس کے مرتب ملک مجید صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اولڈ بوائے ہیں چاہتا ہوں کہ ہم سب ان کی مدد کرسکیں۔ مجھے امید ہے آپ میرے معروضات پر توجہ فرمائیں گے۔ کم سے کم ملک مجید صاحب کو لکھوں گا کہ میں نے ان کی سفارش ایسے کردی ہے۔ میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میں مولانا سے عرض کروں گا اور جو کچھ دال دلیا ہو سکے گا اس سے دریغ نہ کیا جائے گا۔ کورس کی کتابوں کی طباعت کہاں تک پہنچی۔ اس کی طرف سے غافل نہ ہوجیے گا۔

ہم سب بخیر ہیں۔ ذرا گرمی اور حبس زیادہ ہے۔

آپ کا
رشید احمد صدّیقی

ان کا پتہ یہ ہے:

ملک مجید صاحب بی اے علیگ، مرتب: کارواں محلّہ چابک سواراں، لاہور۔

بنام

غلامِ غوث صاحب

(۱)

۲۶ر نومبر

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی،

فرسٹ پارٹ کا امتحان کل پرسوں سے شروع ہونے والا ہے۔ لڑکوں کا تانتا لگا ہوا ہے کہ بتایئے، پڑھایئے، کچھ پڑھائی نہیں ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

تھرڈ ائیر اور فرسٹ ائیر کا ایڈوانسڈ کورس آپ نے پڑھایا ہے۔ لڑکوں کو اس کورس [illegible] جو دِقت ہو اور وہ جو کچھ پوچھنا چاہیں آپ ان کو دُور کریں اور سمجھائیں۔ سب یہی کہتے ہیں [illegible] کلاس میں پڑھائی نہیں ہوئی ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اور یہ ہم پر بہت بڑا اعتراض ہے۔ ان [illegible] روک تھام کیجیے اور لڑکوں کو مطمئن کیجیے۔ پارسال بھی یہی دِقت پیش آئی تھی۔ اس وقت پورا کلاس مجھے اپنے مکان پر لینا پڑا اور خدا خدا کر کے خاتمہ بخیر ہوا۔ یہی چیز اس سال پھر اُٹھی ہے۔ آخر [illegible] تک تھوپ تھاپ کی جائے گی۔

میں آپ کا ادنیٰ اور مخلص نیاز مند ہوں لیکن جو بے اطمینانی طلبا میں پھیل رہی ہے اس کا ازالہ کیوں کر کیا جائے گا اور کب تک کیا جائے گا۔ میں نے ایک آدھ گروپ کو پڑھایا اور سمجھایا [illegible] بھی لیکن کب تک اور کس کس کو میں سمجھاتا بتاتا رہوں گا۔ ایلیمنٹری میں اَب تک میرے پاس کوئی نہیں آیا، جتنے آئے سارے کے سارے آپ کے کلاس کے طالبِ علم تھے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس بارے میں آپ کو کوشش کرنا چاہیے کہ یہ شکایت عام نہ ہونے پائے۔ آپ میری اِس

گزارش کو صرف مخلصانہ تصور فرمایئے اور کسی اور چیز پر محمول نہ کیجیے کیونکہ میں کسی اور حیثیت سے نہ کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں اور نہ اس کی اہلیت رکھتا ہوں اور غالباً اس کے آپ بھی معترف ہوں گے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

(۲)

۳۰ نومبر

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی،

میرا اس پر لکھنا آپ کے منصب کی صریحی توہین ہے آپ خود براہِ راست ہر چیز کا انجمن سے بھی مطالبہ کر سکتے ہیں۔

آپ نے جو ۔۔۔ بھیجا ہے اس سے مجھے اتفاق ہے میں یہ البتہ چاہتا تھا کہ پرو وائس چانسلر صاحب کے لیے آپ کا خط کا ملخص انگریزی میں ہوتا تا کہ وہ سارے خیر خواہ بھی سمجھ سکتے۔ احسن صاحب سے کہیے وہ ضروری باتوں کا انگریزی خلاصہ لکھ دیں۔

سکریٹریوں کا اعلان کر دیجیے۔

خادم
رشید احمد صدیقی

(۳)

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مخدومی،

میں ابھی ابھی بشیر صاحب سے مل کر آیا ہوں انہوں نے طفیل احمد صاحب کو ہدایت کردی ہے کہ آپ کے روپے دے دیئے جائیں۔ کل تو گیارہ بجے یونی ورسٹی بند ہو جائے گی

اس لیے کل انشاء اللہ روپے مل جائیں گے۔

حاضری کی معافی چاہتا ہوں اس وقت جس حلیہ میں بیٹھا ہوں وہ نا گفتہ بہ نہیں بلکہ نادیدہ بہ ہے۔ گو بزرگوں سے کون سی بات چھپی ہے۔ لیکن ایسے بھی کیا دیدہ کی صفائی!!

صاحب زادہ نہیں ہے، لیکن راستہ میں مرزا صاحب کو ایک دوکان پر ملے تھے چنانچہ مرزا صاحب نے ان سے۔۔۔۔۔۔ چیزیں مل جائیں۔ خط اور بقچی میں نے مرزا صاحب کو دے دیا تھا۔

خاکسار

رشید احمد صدیقی

بنام

محترمہ فاطمہ علی خاں[1]

(۱)

۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیزہ و محترمہ، سلامِ مسنون۔

اُردو کالج میگزین کے لیے میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ہو سکا تو کچھ نہ کچھ لکھوں گا لیکن بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، یعنی ایسی معذوریاں پیش آئیں کہ وعدہ پورا کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ دراصل جب کام کرنے میں جی نہیں لگتا تو دشواریاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں ورنہ کام میں جی لگتا ہو تو دشواریوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے بڑے سے بڑے کام بڑی دشواریوں کے ہوتے ہوئے کیسے انجام پاتے۔

اپنے اس اعتراف سے شرمندہ ہوں لیکن اس اعتراف اور شرمندگی کو چھپانے سے کیا حاصل جب یہ چھپائے نہ جا سکتے ہوں۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ شاید میرے اس اعتراف سے آپ میری وعدہ خلافی کو معاف فرما دیں۔ آپ اور آپ کے شریک کار، ماشاءاللہ نوجوان ذی استعداد اور حوصلہ مند ہیں پھر کسی کی محتاجی کیوں۔ میگزین نکالیے۔ صورتِ حال بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی۔ نوجوانوں کا بوڑھوں کا سہارا لینا بدشگونی ہے۔ ان کی دعا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ مقبول ذرا کم ہوتی ہے، لیکن مقبول ہوتی ہو یا نہ ہو اس کا مصرف بھی اور کیا رہ گیا ہے؟ سب کو دُعا پہنچایئے۔ اللہ آپ کو تندرست خوش اور نیک نام رکھے۔ آمین!

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] محترمہ فاطمہ علی خاں مرحوم، قاضی عبدالغفار کی صاحبزادی، اُردو کالج میگزین ۶۴-۱۹۶۳ء، حیدرآباد دکن کی مدیرۂ اوّل تھیں۔

بنام

سیّد فرخ علی جلالی صاحب

(۱)

جمعہ ۱۴ راگست ۱۹۵۹ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مکرمی، تسلیم!

خط ملا لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ آپ P.V.C سے ملے یا انہوں نے آپ کو بلایا یا نہیں۔ میں نے دوسرے ہی دن آپ کی سفارش P.V.C صاحب کو لکھ بھیجی تھی۔ اگر یہ معلوم ہو کہ اُن کی توجہ سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا تو ظاہر ہے مجھے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اس کا پتہ مجھے لگ گیا تھا کہ آپ کو دو سال کی رخصت بلا تنخواہ مل گئی۔

طالب خیر
رشید احمد صدیقی

(۲)

۷ ردسمبر ۱۹۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

شفیقی، سلامِ مسنون!

دعوت نامہ[1] موصول ہوا۔ خوش ہوا، شکر گزار بھی۔ اللہ تعالیٰ دولھا دلہن کو اپنی برکتوں سے نوازے آمین۔ کاش شریکِ تقریب ہو کر آپ سب کو تہنیت پیش کر سکتا، لیکن خلوص اور

خیر خواہی زمان و مکان کی قید کی پابند نہیں ہوتی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] فرخ جلالی صاحب کی شادی کے دعوت نامہ کے جواب میں یہ خط تحریر کیا گیا۔

(۳)

یکم جولائی ۱۹۶۱ء

ذکاءاللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیزم!

خط ملا، عزیزوں اور بزرگوں کی اچانک اور پے در پے وفات[1] کی خبر آپ نے سنائی۔ میں اس سے مبہوت رہ گیا۔ جانکاہ سانحے تو ہزار دو ہزار میں کبھی کبھی دو ہی ایک کو زندگی میں پیش آتے ہوں گے۔ پھر ایسی حالت میں جب کہ آپ خود طرح طرح کے تردّد اور تکالیف میں مبتلا ہوں، لیکن کیا کیجیے گا۔ عزیزانِ رفتہ کی بازیافت ناممکن۔ ایسا اب تک نہ کہیں دیکھا گیا نہ سُنا۔ اس لیے وہی کرنا پڑے گا جو کتنا ہی تلخ یا ناقابلِ برداشت کیوں نہ ہو۔ ہم سے آپ بدرجہا بہتر کرتے آئے ہیں یعنی خدا کی مرضی کے سامنے جھک جانا اور اس سے سہارا طلب کرنا۔

خدا اور رسول سے بڑا اور بہتر مشورہ دینے والا اور کون ہوسکتا ہے اس لیے اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ ناسمجھ اور سمجھ دار دونوں کو صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایک کی ناسمجھی بے سُود اور مضر ہے۔ اس کے لیے بھی اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی۔ دوسرا اپنی سمجھ داری سے خود فائدہ اُٹھاتا ہے اور دوسروں کو پہنچاتا ہے ان دونوں میں مقام آپ خود متعین کر لیجیے۔ عقل مند بندہ وہ ہے جو مصیبت میں صرف اللہ کا سہارا پکڑے اور اس طور پر مصیبت کی ذمہ داری خدا پر ڈال کر اس کا مستحق ٹھہرے کہ خدا اس نقصان کی تلافی کرے۔ نہ یہ کہ گریہ وزاری و مایوسی و نااُمیدی کو راہ دے، گنہگار بنے اور کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے۔۔۔۔[2] ۔۔۔گھبرائیے نہیں۔ ان کا احساس کر کے اور زیدہ ثابت قدم رہنے کی کوشش کیجیے۔ مصیبت میں اچھے آدمی کی خوبی اور معمولی آدمی کی کمزوری اُجاگر ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں کہنے کو تو کہہ گیا لیکن جانتا ہوں کہ ان عزیزوں کو کیسے بھلا دیا

جائے جن کے دم قدم سے زندگی نعمت معلوم ہوتی تھی۔ کیسی کیسی اُمیدیں انھوں نے آپ سے قائم کر رکھی تھیں۔ کتنی اُمیدیں آپ کی ان سے وابستہ تھیں اور کتنی اچھی صلاحیتیں آپ میں اُن کے لیے بیدار رہتی تھیں۔

دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

Farrukh Jalali Saheb.
Room No. 2.
Main Hostel. Bareily College.
Bareily

۱۔ فرخ جلالی صاحب کی والدہ کی وفات کے موقع پر یہ تعزیتی خط تحریر کیا۔

۲۔ عبارت پڑھی نہ جا سکی۔

بنام

میکش اکبرآبادی صاحب

(۱)

۶/اپریل ۱۹۵۸ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

محترمی، آداب نیاز۔

آپ نے میرے یا میری کتاب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے تہہ دل سے شکرگزار ہوں اور آپ کی صحت و عافیت کا دُعا گو۔ آپ کی بیماری میں کوئی مستند تیماردار خدمت میں حاضر ہوتے ہوں تو میری طرف سے ان سے یہ بیگار لیجیے کہ وہ شہر میں دریافت کر کے آئیں کہ سات چار (7x4) کی دری بنی بنائی مل جائے گی یا نہیں اور بنوائی جائے تو کیا لاگت آئے گی؟ دری یک رنگ ہو (مثلاً صرف سُرخ) اور دبیز ہو۔ اسی طرح سات چار کا سوتی قالین کتنے میں ملے گا یا تیار کیا جا سکے گا؟ اگر تیار کرانا پڑے گا تو پھر اسے یک رنگ ہونا چاہیے۔

یہ دونوں چیزیں اگر تیار کرانی پڑیں تو کتنے دنوں میں ہو جائیں گی۔ تفصیلات معلوم ہو جائیں تو بقیہ باتیں عرض کروں گا۔ دُعا ہے کہ آپ اتنے اچھے ہوں کہ اس طرح کی فرمائش سے بدحظ نہ ہوں۔ اس سے بھی زیادہ اچھے ہوئے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ صرف فرمائشوں میں اضافہ کرنا پڑے گا۔

خیر طلب
رشید احمد صدّیقی

بنام

جناب وصی صاحب

(۱)

۳۱/مارچ ۱۹۶۷ء

ذکاء اللہ روڈ،
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عزیزِ گرامی، دعا و سلامِ مسنون!

اُردو نامہ ملتا رہتا ہے اور تعلیمی بورڈ کی دیرینہ و مسلسل گراں بار علمی و ادبی خدمات کا حال سن کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔ اُردو لغت کا کام جس پیمانے پر جس معیار کو پیشِ نظر رکھ کر جس مستعدی سے کیا جا رہا ہے مکمل ہو جانے پر وہ کام اور کام کرنے والے دونوں ''یادگارِ زمانہ'' متصور ہوں گے۔ انشاللہ۔

آپ کی تحریر بڑی پُر مغز اور دل نشین ہوتی ہے۔ تنقید و تبصرے میں خاص طور پر بڑی سنجیدگی و منصفی ملتی ہے۔ غزل کا بھی یہی انداز ہے۔ بیشتر اشعار میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی ہے جس سے مطالعہ کی محنت وصول ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں آپ میں کہاں سے اور کیوں کر آئیں؟ اُمید ہے ان پر غور کر کے اپنے سے ہمیشہ خوش ہوا کریں گے۔ ایک ریویو یاد آتا ہے جو آپ نے کسی کے خطبۂ صدارت پر لکھا تھا جنابِ صدر نے اُردو کے بجائے انگریزی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں قرار دیا تھا۔ انگریزی کی وکالت اور اُردو کی مخالفت میں (اور باتوں سے قطع نظر) لہجہ کے اعتبار سے بھی بے سُرے ہو گئے تھے۔ آپ نے گرفت کی تھی اور مذکورہ خطبے پر بڑا معیاری ریویو لکھا تھا۔

اُردو نامہ کے زیرِ نظر شمارہ ۳۷، بابت ۲۷/مارچ ۱۹۶۷ء میں آپ نے جمیل جالبی صاحب کی کتاب ''پاکستانی کلچر'' پر ریویو کیا ہے۔ اس کتاب پر ایک اور ریویو کسی اُردو رسالے میں پڑھا تھا۔ اس کا صرف دھندلا سا خاکہ ذہن میں رہ گیا ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری

ہے۔ صرف اس پر آپ کا ریویو سامنے ہے۔ موہنجوداڑو کو اپناتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ پاکستان کی قدامت ایک حقیقت ہے۔ اس طرح کے بیانات سے جذبات یا تمناؤں کی چاہے جتنی تسکین ہوتی ہو عقل و انصاف کے تقاضے نہیں پورے ہوتے۔ تصوف یا شاعری خوب ہو یا نہیں برائے تاریخ کسی طرح خوب نہیں۔ ہمہ اوست یا ہمہ از وست کا ایک مقام ضرور ہے لیکن اس کا رشتہ تاریخی حقائق سے نہیں ہے۔ موہنجوداڑو پاکستان کی تخلیق ہے نہ تعمیر۔ انکشاف بازیافت اور عطیہ بھی نہیں۔ جب تک کسی شے یا حقیقت سے کسی کا اس نوعیت کا رشتہ نہ ہوگا وہ شے یا حقیقت اس کی نہ کہلائے گی۔ ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست کے رو سے کبھی پاکستان کا قبضہ موہنجوداڑو پر ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ دونوں میں مذہب، معاشرت، نصب العین، تہذیب یا کلچر کا اتنا بڑا خلا vacuum (خلیج نہیں) حائل ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑنا درست نہ ہوگا۔ تاریخی و تہذیبی آثار کو مہاجروں کی ملکیت (Evacuee property) قرار دینا ناانصافی ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ لیکن یہ وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب آپ ہی نہیں ہم بھی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تو موہنجوداڑو صرف اپنی تہذیب کا رہین منت ہے اس لیے انہی کی ملکیت ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ پاکستان کے حصے میں آ گیا جیسے محض بر بنائے اتفاق کوئی ملکیت مل جائے۔ آپ ہی بتائیں فراعنہ مصر کے عہد اور آثار کو ناصر اور ان کی حکومت سے کیا واسطہ سوا اس کے کہ ان پر قبضہ ہے۔ اسپین کے اسلامی عہد کے آثار و باقیات کو موجودہ حکومت اسپین اپنا یا عیسائیوں کا کارنامہ نہیں، مدت مدید سے وہ ان پر قابض اور متصرف چلے آتے ہیں۔ موہنجوداڑو پر پاکستان کا lien (حق قانونی) کو (اگر مانا جا سکتا ہے) جب پاکستان اس کی حیثیت میں اپنی طرف سے کوئی نہایت درجہ نمایاں اور قابلِ لحاظ اضافہ کر سکے۔ ہندوستان پر مسلمان اور انگریز دونوں کی حکمرانی رہی ہے لیکن اجنتا یا ایلورا مسلمان یا انگریز کے کبھی نہیں رہے۔ ان دونوں نے اس کی خواہش یا دعویٰ کیا؟ اس لیے اس ''برقع مہ کنعاں'' یا ''حجلۂ گاہِ زلیخا'' کی تخلیق میں ان ہُوا رہا ہے۔ مسلمان اور انگریز دونوں سے زیادہ ہندو اجنتا اور ایلورا سے قریب رہے ہیں۔ سب سے زیادہ قریبی اور صحیح حق ہندوؤں کا ہے۔ اسی طرح فراعنہ مصر کے عہد و آثار کو ناصر اور ان کی حکومت سے نہ کوئی مذہبی رشتہ ہے نہ تہذیبی۔ اسلامی عہد کے آثار کو موجودہ اسپین کی حکومت اپنا یا عیسائیوں کا کارنامہ نہیں قرار دے گی۔ آپ نے اس سلسلہ میں جن شعرا اور شاعری کو عہدِ اسلام کے شعرا اور شاعری سے ربط دیا ہے اس مثال کے پیشِ نظر بھی پاکستان کا موہنجوداڑو سے رشتہ نہیں بنتا اس لیے کہ جاہلیت اور اسلام

کے عہد کی شاعری میں لسانی، قومی اور نسلی تسلسل ملتا ہے جو پاکستان کے موہنجوداڑو میں نہیں ملتا۔ آپ کے اس قول سے مجھے کامل اتفاق ہے کہ موہنجوداڑو عالمی تہذیب کے آثار میں شامل ہے اس لیے پاکستان کو اپنا اظہار نہ کرنا چاہیے لیکن اس سے موہنجوداڑو سے پاکستان کی قرابت نہیں ثابت ہوتی۔

ان باتوں کے باوجود کہوں گا کہ موہنجوداڑو کی حفاظت واحترام اور اس کی اہمیت وعظمت کے اعتراف واعلان میں پاکستان کچھ کرے۔ اس لیے کہ وہ پاکستان کی ''ولایت'' میں ہے۔ دراصل خط لکھنے بیٹھا تھا آپ کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں پھر کچھ اور باتیں ذہن میں آئیں ان کا بھی اظہار کر دیا مگر یہ خط ذاتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے میری دیرینہ درخواست ہے کہ ان کے یا کسی دوسرے کے نام کے میرے خطوط شائع نہ کیے جائیں۔ یہی گزارش اس خط کے بارے میں آپ سے ہے۔

فی امان اللہ۔

بنام [1]

(۱)

۲۶ر جون

پنج ولا

Punj Villa Solon

قبلہ،

حسب ذیل فقروں پر نقد و جرح مقصود ہے۔ ایک بڑے اہم محکمہ سے یہ استفسارات یونی ورسٹی میں آئے ہیں اور استصواب کیا گیا ہے کہ ایک امتحان کے پرچہ میں یہ عبارت یا فقرے آئے ہیں اور محل گرفت ہیں۔ مسلم یونی ورسٹی کے ادارہ اُردو کی رائے کیا ہے؟ آپ براہِ کرم اپنے فیصلہ سے مجھے ہم روزہ ڈاک سے مطلع فرمائیے۔ میں منتظر رہوں گا اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنا ہرج کر کے اس کام کو میری خاطر سے کر دیں گے۔ 'ہم روزہ ڈاک' کے فقرہ کو ملحوظ رکھیے۔ خدا آپ کو گرمی سے نجات دے اور آم مبارک کرے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

جن فقروں کے اوپر خط کھینچ دیا ہے وہ زیرِ بحث ہیں۔ ربط کے لیے عبارت بھی لکھ دی ہے۔

۱۔ جن کاشت کاروں اور زمینداروں سے انہوں نے مال خرید کیا تھا ان کا تقاضا وقت سے پہلے شروع ہوگیا۔

۲۔ شیخ صاحب جو صبح و شام کے تقاضوں سے عاجز آ گئے تھے اس محابلت کو غنیمت سمجھتا۔

۳۔ جب مجھ کو عام حالات سے آگاہ کیا گیا تو میں اُن تمام معاملات سے بیک وقت

متعارف ہو گیا جن کو سمجھنے کے لیے طویل مدت درکار تھی۔

۴۔ انہوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے اس کو منظور کر لیا مگر خواہش کی کہ پیکن کو چھوڑنے سے پیشتر میں ان کو مستقل جواب دوں۔

۵۔ میں نے اس معاملہ کے متعلق نہایت غور و تعمق کیا کہ بادشاہت کی پیش کش کو میں منظور کر لوں یا انکار کر دوں۔

۶۔ مجھے اپنی بیوی اور بچوں کا بھی خیال کرنا تھا اور بالخصوص اس علیحدگی کی زندگی بھی پیش نظر رکھنا تھا جو مجھے اس دنیا کی الگ تھلگ گوشے میں بسر کرنی ہوگی۔

۷۔ عیسائیوں کو حیرت تھی کہ پانسو مسلمان صبح سے اپنے سے کئی کئی گنا آدمیوں سے لڑ رہے تھے اور مغلوب نہیں ہوئے اس لیے وہ اور زیادہ تعداد لیے مسلمانوں کے مقابلہ میں آئے۔

۸۔ ابھی مسلمان اچھی طرح دم بھی لینے نہ پائے تھے کہ پھر میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔

ہو سکے تو وجوہِ اختلاف بھی لکھ دیجیے گا، یعنی بطور سند کے بھی کچھ ہو۔ دِقت ہو تو جانے دیجیے گا۔

ا معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تحریر کس کے نام ہے۔

ضمیمہ

خطوط بنام رشید احمد صدّیقی صاحب

ابوالکلام آزاد صاحب

(۱)

۴؍جنوری ۱۹۴۸ء دہلی

صدیقی،

کوئی صاحب خورشید الاسلام صدیقی ہیں، کالج میگزین میں اُن کا ایک مضمون شبلی مرحوم پر نکلا ہے۔ انہوں نے شبلی مرحوم کی نسبت جو رائیں قائم کی ہیں اُن سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اُن کا اُسلوبِ تحریر دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میں نے ہمیشہ افسوس کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اُردو میں ایک عام تنقیدی رنگ کے سوا تجدد و تازگی مفقود ہے، ہمارا نیا طبقہ نئی تعلیم کی پیداوار ہے اس لیے اُن سے توقع کی جاتی تھی کہ یورپ کے ادبی اسالیب و مذاہب کو اپنے اندر جذب کریں گے اور تجدد و تازگی کے نمونے نمایاں کر سکیں گے لیکن بہت کم کوئی ایسی چیز نظر سے گزرتی ہے۔ میں ادھر سترہ اٹھارہ برس سے انگریزی مطالعہ میں کھویا گیا ہوں اور اُردو اخبار و رسائل کی کم خبر رکھتا ہوں، اس لیے ہوسکتا ہے اِدھر کی رفتار ترقی مجھے معلوم نہ ہو۔

بہر حال یہ مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی انہیں معلوم ہو یا نہ ہو لیکن انہوں نے ایک فرنچ اسکول کا تتبع کیا ہے۔

یہ صاحب کہاں ہیں، اور کیا کرتے ہیں، ممکن ہو تو مطلع کیجیے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(مطبوعہ علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء)

جگر بریلوی صاحب

(۱)

۶/۱اکتوبر ۱۹۵۹ء ۱۴/۴ ویسٹرن کچہری روڈ، میرٹھ

مکرمی، تسلیم!

مجھے آپ سے نیاز حاصل نہیں لیکن ہم دونوں اُس دنیا کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو کی محبت کا راج اور اس کی خدمت کا قانون ہے۔ اس غائبانہ یگانگت کی ترغیب پا کر اُردو کا ایک شیدائی جس نے اپنی ساری عمر اس کی بے لوث خدمت میں گزار دی، میں یہ چند سطریں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس کمیٹی کے سکریٹری ہیں جو اُردو کی تاریخ مرتب کرانے کے لیے علی گڑھ یونی ورسٹی نے قائم کی ہے۔ شاید آپ کو خیال ہو کہ ۱۹۳۸ء میں رسالہ 'زمانہ' کان پور میں میرے ایک مضمون ''اُردو، ہندی اور ہندوستانی'' پر ایک بحث چھڑ گئی تھی جو کم و بیش تین سال تک چلتی رہی۔ اس میں دو حقیقتوں پر خاص طور پر اُردو والوں کی توجہ کے لیے میں نے واضح کیا تھا، ایک یہ کہ اُردو کے ہر ارتقائی دَور میں ہندو بھی کیا بہ لحاظ کیفیت اور کیا بہ لحاظ کمیت، صفحۂ اوّل کے شاعر اور نثر نگار رہے ہیں، لیکن اُردو کی تاریخ سے سب مٹ گئے اور بے نام و نشان ہو گئے۔ اس کسمپرسی اور گم نامی میں دس بارہ تذکروں اور تاریخی کتابوں سے اعداد پیش کیے گئے تھے۔

دوسری یہ تھی کہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اُردو ہندو مسلم دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہے لیکن اس کے ادب میں ہندو معاشرت و مذہب کے، جس کا ایک قوم کی زبان کو امین و محافظ ہونا چاہیے کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

نتیجہ یہ نکالا تھا کہ اگر اُردو کی ترقی منظور ہو اور اسے بجا طور پر مشترکہ زبان کا نام دینا ہے

تو ہندوؤں کے ادبی کارناموں کو دور بدور تاریخ میں نہیں لایا جائے۔ان کی تصانیف کو عام کیا جائے۔دوسری کمی اس سے خود بخود پوری ہو جائے گی۔اگر ایسا نہ ہوا تو اُردو کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میرے آخری مراسلے کو جس میں ان دونوں مسئلوں پر خلاصہ کی بحث تھی بابائے اُردو مولانا عبدالحق نے اس وقت کے اپنے پرچے ''ہماری زبان'' میں ''زمانہ'' سے نقل کیا تھا۔

میری ''اُردو، ہندی، ہندوستانی'' والی بحث کو ختم ہوئے آج کم وبیش بیس سال ہونے کو آئے اور اُردو والوں کی روش میں ذرا بھی فرق نہیں۔لطف یہ ہے کہ اُردو کی قسمت جن کے ہاتھ میں ہے ان میں سے اکثر کو میری رائے سے اتفاق ہے مگر عمل میں کوئی تبدیلی نہیں۔معاف فرمایئے اگر ایسا نہیں تو مجھے بتایا جائے کہ ملک کی سب سے بڑی جماعت یعنی انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے ہی اس باب میں کیا کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اپنی مذکورہ بالا بحث میں جس خطرے کا اظہار کیا تھا سامنے آ گیا۔یقیناً اُردو کو علاقائی زبان بننے میں اتنی رکاوٹ نہ ہوتی اگر میرؔ، سوداؔ، آتشؔ، ناسخؔ، مومنؔ، آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ، سرسیّد وغیرہم کے ساتھ ہر دَور میں اُردو کے ہندو ادیب خدمت گزاروں کے نام بھی ادب وشعر میں باقی رہ جاتے اور ان کی تصانیف بھی۔

اس وقت اس مضمون میں بحث کا مقصود یہ ہے کہ اب جو اُردو کی تاریخ علی گڑھ یونی ورسٹی کے زیرِ نگرانی مرتّب ہو رہی ہے ان اُمور کو اس میں خلوصِ نیت کے ساتھ مدِّ نظر رکھا جائے، یعنی ابتدا سے آج تک ہر دَور کے اور ہر صنف کے ہندوؤں کے ادبی خدمات اس میں شامل کیے جائیں۔ برائے نام ذکر واذکار نہ ہوں جیسا کہ اب تک تاریخ اور تذکرہ لکھنے والے کرتے آئے ہیں۔اُردو کی مقبولیت اور اس کی آئندہ زندگی کے لیے اب یہ پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ آئندہ اُردو کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں کو اختیار ہے۔میں نے اپنی حقیر رائے پیش کر دی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ کوئی بحث ومباحثہ چھیڑنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔اگر ان معروضات کو آپ شایانِ التفات اور قابلِ عمل متصور فرمائیں تو اُردو کے ہی حق میں اچھا ہوگا۔ میری کوئی ذاتی غرض اس میں نہیں ہے۔

نیاز مند
جگر بریلوی

(مشمولہ رشید احمد صدّیقی کے خطوط مرتبہ پروفیسر آل احمد سُرور)

خواجہ غلام السیّدین صاحب

(۱)

۱۴/اکتوبر۱۹۶۰ء　　　　　　　　　　　　　ٹوکیو

رشید صاحب، تسلیم!

یہ جاپان کی سرزمین ہے جس پر ابھی صرف بارہ گھنٹے زندگی کے بسر ہوئے ہیں اور ان میں بھی ایک نامبارک ترکام کی آمیزش! لہٰذا ابھی اس کے بارے میں کچھ کہنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

آپ کا خط اور خورشید الاسلام صاحب کا جواب الجواب میرے سامنے ہے۔ اس کے بارے میں مَیں مزید جواب کیا دوں؟ انہیں میری بعض تجویزوں سے اتفاق نہیں ہے، بعض سے اختلاف۔ بالکل یہی صورتِ حال میرے ساتھ ہے! اس لیے اس کا تصفیہ آپ خود ہی کر لیں یا عابد صاحب سے مشورہ لے لیں۔ میرے اور ان کے approval میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ اس انتخاب پر ایک ماہر ادیب کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں (جو اپنی ہی تصنیف پر غور کر رہا ہو!) اور میرا نقطۂ نظر ایک معلّم کا ہے جس کی ادبی مہارت محدود ہے۔ مثلاً مجھے Rebalais تک کی Cruelty پسند نہیں خود اس کی ادبی حیثیت کے لیے کچھ بھی کہا جائے۔ ''واٹرلو'' کی مقبولیت (نوجوانوں میں) رائے کا معاملہ ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔ میرا تو خیال ہے کہ ان کو نہ بہت گرمائے گی نہ موجودہ detective ناولوں کی طرف سے ان کو بدظن کرے گی۔ جب دنیا بھر کے ادب میں سے صرف دو سو صفحے انتخاب کرنا ہے تو جو چیز لی جائے وہ form اور content دونوں کے اعتبار سے بلند ہونی چاہیے اور ساتھ ہی اس میں نوجوانوں کے لیے کشش ہونی چاہیے۔ محض یہ دلیل ہی ''اعلیٰ ادب'' میں شامل ہے کافی نہیں۔ بہر حال! میں اپنی رائے پر ضد نہیں کرتا۔ اس قسم کے میٹریل کو تو سال بہ سال تجربے کی روشنی میں بدلنا اور بہتر بنانا ہوگا۔ لہٰذا مصلحت کو دیکھئے اور کام

آسان کیجیے۔

سب عزیزوں اور دوستوں اور خورشید صاحب کو میرا اسلام۔

مخلص

سیّدین

(۲)

۱۶؍دسمبر ۱۹۶۰ء[1]

حبیب محترم، تسلیم نیاز!

میرا گذشتہ خط تو آپ کو مل چکا ہوگا لہٰذا یہ خط تو اب (بقول ماسٹر جواد کے) محض Art for the sake of art کے طور پر لکھ رہا ہوں تا کہ آپ کو بتادوں کہ آپ کا ۱۲؍دسمبر کا خط مل گیا۔ میں نے (علاوہ ریویو کے جو براہِ راست بھیجے ہیں) باقی تمام مسودے (مع تصاویر کے) دہلی بھیج دیئے ہیں تا کہ با احتیاط کسی ''آتے جاتے'' کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ جائیں یا آپ انہیں 63-F, Sujan Singh Park[2] سے منگوالیں۔

کل دوروز کے لیے دہلی جارہا ہوں۔ ''باقی خیریت ہے''۔

آپ کا

غلام السیّدین

---

[1] تاریخ درج نہیں لیکن سری نگر ڈاک خانہ کی مہر ۱۶؍دسمبر ۱۹۶۰ء کی ہے۔

[2] سیّدین صاحب کی رہائش گاہ کا پتہ۔

(۳)

۱۱؍جنوری ۱۹۶۱ء

دہلی

حبیبِ محترم، تسلیم!

میں سمجھتا تھا کہ آپ خط محض خلوص نیت ہی سے لکھتے ہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ بہ سبیل کاروبار بھی ایسا کرتے ہیں۔ مرسلہ 'مواد' پہنچ گیا، کوشش کروں گا کہ اس کو جلد دیکھ

لوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غالباً اس بارے میں زیادہ radical نظرِ ثانی کی ضرورت ہوگی۔ خاص طور پر اس کے پیش کرنے کے طریقہ کے بارے میں غالباً حال ہی میں عابد صاحب اور Simons کی بھی اس بارے میں کچھ گفتگو ہوئی ہے جس سے میرے پہلے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس مواد کو طلبہ کے کارآمد بنانے کے لیے ایک بہتر اور زیادہ دل چسپ ''پیش کش'' کی ضرورت ہے۔

میں ۱۶ر کی صبح کو طوفان ایکسپریس سے پٹنہ جا رہا ہوں اگر آپ کسی کو اس روز اسٹیشن بھیج دیں تو اُمید ہے کہ مرسلہ کاغذات اس کے ذریعہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

خدا کرے آپ مع عزیزوں کے بخیریت ہوں۔

مخلص

سیّدین

(۴)

۳ر فروری ۱۹۶۱ء　　　　دہلی

حبیب محترم، تسلیم نیاز!

گرامی نامہ ملا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ریڈنگ میٹریل کے بارے میں اس وقت مزید مشورہ اور اس کے بعد اس پر محنت کرنے سے مسئلہ حل نہ ہوگا۔ اب تو ضرورت یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب کے مشورے سے دوبارہ مشورتی کمیٹی کا جلسہ کیا جائے اور مناسب ہو تو اس میں مسٹر ہمن کو بھی بلایا جائے تاکہ آئندہ کے لیے طریقہ کار کا تعین ہو سکے۔ لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ آپ اس بارے میں زیدی صاحب سے گفتگو کر لیں تاکہ کمیٹی کے مشورے اور UGC کے اتفاق رائے سے آئندہ کام کی تکمیل کی جائے۔ Man in the New World[1] کے بارے میں دو مرتبہ آپ سے علی گڑھ میں بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ وہ بات رہ گئی۔ اس کو لکھنے کا وعدہ ''گلے گلے'' ہے لیکن ابھی تک اس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ معلوم ہوتا ہے جس وقت میں نے ''بر سبیلِ تذکرہ'' (lightly) اس کا وعدہ کیا تو کسی ''ذہنی دھند لکے'' (جس کو آپ Mental Illucidity سمجھ لیجیے) کے عالم میں تھا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام خاصا وقت اور محنت اور مطالعہ چاہتا ہے۔ لکھنے کی کوشش ہے اگر وقت ملا اور زندگی نے وفا کی تو لکھوں گا، لیکن

وقت کا تعین کیسے کروں۔ کچھ آپ کو اندازہ ہے کہ اس مقالے کی ضخامت کیا ہونی چاہیے؟

عزیزوں اور احباب کو ہم سب کی طرف سے سلام اور دعا۔

آپ کا

سیدین

---

1. سیدین صاحب کی یہ تصنیف شائع ہو چکی ہے۔

Man in the New World. K. G. Sayyadain. Asia Publishing House, Bombay, 1960

(۵)

۱۱رجون ۱۹۶۲ء

سری نگر

رشید صاحب، تسلیم!

پھر مجھ سے تاخیر ہو گئی اور آپ ایک عدد تار داغ گئے یعنی یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد!

میں گزشتہ ہفتہ بھر سے بے مبالغہ کالرا، چیچک، بخار اور زکام کھانسی میں مبتلا ہوں۔ مطلب یہ کہ ویزا حاصل کرنے کے لیے کالرا اور چیچک کے ٹیکے لگوائے تھے اور وہ رنگ لائے۔ ابھی تک اُن سے جاں بر نہیں ہو سکا۔ باوجود اس قصہ کے آپ کے خوف سے کتاب لکھنے کا کام، کبھی بہ نرمی، کبھی بہ زوری جاری ہے، لیکن ابھی تو پہلا rough مسودہ مکمل کرنے کی منزل ہے، وہ ہو جائے تو خدا آگے کا راستہ صاف کر دے گا۔ لکھتے لکھتے کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا لکھوں اور کبھی یہ کیا کیا نہ لکھوں۔

میں ۲۰رجون کو دس بارہ روز کے لیے Milan جا رہا ہوں، اُمید ہے واپسی پر مسودہ مکمل ہو سکے گا۔ اس بور خط کی معافی۔ اس سے صرف ایک اچھی بات ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بالعموم میرا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔ سب عزیزوں و دوستوں کو دعا و سلام!

محترمہ کی کوئی خبر؟

مخلص

غلام السیدین

(۶)

EDUCATIONAL ADVISER
JAMMU & KASHMIR GOVERNMENT

۲۰/اگست ۱۹۶۲ء

حبیبِ محترم، تسلیم نیاز!

عنایت نامہ ملا، اس تگ ودَو میں کتاب تقریباً تیار ہوگئی ہے، اگر درز کے کام کو تیاری کہا جاسکے! ایک باب باقی ہے۔ کوشش میں ہوں کہ وہ بھی لکھا جائے۔ تین روز میں یہاں سے رختِ سفر باندھ کر روانگی ہے اور دہلی پہنچ کر مسوّدہ ارسال خدمت کروں گا۔ اس کے بعد آپ جانیں اور آپ کا کام! اس ضمن میں ایک تجویز یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اگر یہ کتاب چھپے تو علاوہ یونی ورسٹی کی اسکیم کا جز وہونے کے دوسری یونی ورسٹیوں میں بھی استعمال ہو سکے۔ اس کی نوعیت کے اعتبار سے امکان ہوسکتا ہے کہ یہ اس غرض کے لیے منظور ہو جائے (شاید مُلک راج آنند کی کتاب کے بارے میں اس قسم کی تجویز تھی) ایسی صورت میں آپ کا کیا مشورہ ہے اور کیا یہ کام ایشیا پبلشنگ ہاؤس کے سپرد ہوسکتا ہے؟ اس خط کا جواب 63-F, Sujan Singh Park, New Delhi کے پتے پر دیجیے گا۔

مولوی مقتدیٰ خاں کے معاملہ میں جلدی کرانے کی سب تجویزوں پر عمل کر چکا ہوں۔ اگر اَب بھی کام نہ ہوا ہو (جس کا برابر وعدہ کیا جاتا ہے) تو آپ بہ جرأتِ رندانہ ایک خط وزیر اعظم کشمیر کے نام داغ دیجیے۔ سب احباب کو سلامِ شوق۔

مخلص

سیّدین

(۷)

۶/ستمبر ۱۹۶۲ء دہلی

رشید صاحب مکرم، تسلیم نیاز!

(۱) حسب ارشاد بل دستخط کر کے واپس کرتا ہوں۔ ٹکٹ آپ ضرور لگالیں کہ میری دسترس سے باہر ہے!

(۲) ایک باب اور (اگر ہو سکا) تو چوتھا باب ہوگا اور Art of Living باب پنجم کیونکہ اس کو میں آخری باب رکھنا چاہتا ہوں۔

(۳) اگر بمبئی میں ایشیا پبلشنگ ہاؤس سے بات ہو سکی تو کروں گا اور اس کا ماحصل آپ کو لکھ دوں گا۔

بس اور کیا عرض کروں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ باگ پر ہاتھ ہے نہ رکاب میں پاؤں۔

سب کی طرف سے سلام

مخلص

سیدین

(۸)

۹ر دسمبر ۱۹۶۲ء

KGS
Versity Professor of Education
School of Education
Wiscusin University
Madison (Wisconsin) USA

رشید صاحب، تسلیم!

آپ نے تو خط اس لیے نہیں لکھا کہ میرا مسودہ آپ کو مل گیا ہے، اب کیا ضرورت ہے۔ میں نے اس لیے نہیں لکھا کہ گذشتہ ۶ ہفتے سے اپنی بیوی کی شدید علالت کی وجہ سے بہت پریشان رہا ہوں۔ علالت بھی ایسی کہ ڈاکٹروں نے بھی دیکھی اور سنی نہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے زندگی کا معمول اور اس سال کا ذہنی نقشہ جو مرتب کیا تھا وہ بالکل درہم برہم ہوگیا۔ ابھی تک مرض کی پوری تشخیص نہیں ہوئی اور نہایت سخت اندیشے کی منزل سے نکل جانے کے بعد کی پریشانی باقی ہے۔

دعا کیجیے کہ خدا انہیں جلد صحت دے۔ نہایت سخت اور صبر آزما قسم کے ٹیسٹ کا بار اُنہوں نے جس صبر اور ضبط کے ساتھ ہی نہیں بلکہ خوش مزاجی کے ساتھ اُٹھایا ہے وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے بھی ایک نیا تجربہ ہے۔ ان حالات میں اپنا کام کچھ پیدل ہی چل رہا ہے۔ فی الحال تو پڑھانے سے زیادہ کچھ پڑھنے اور لکھنے کا شغل ہے۔ اگلی ٹرم پڑھانا بھی ہوگا۔ خدا کرے اس

وقت تک مریضہ کو اسپتال سے چھٹی ہو جائے اور وہ صحت یاب ہو کر گھر کا کام سنبھال لیں جو اس وقت سیدہ علاوہ اپنی کالج کی پڑھائی کے (میری unofficial مدد سے) انجام دیتی ہے۔ یہاں کی یونی ورسٹی میں واقعتاً وہ فضا ہے جو ایک پوری یونی ورسٹی میں ہونی چاہیے اور کام نہ کرنے والا طالب علم ملیریا کے جراثیم کی طرح ناپید ہے اور ان میں سے بیشتر طلبہ خود اپنی روزی کماتے ہیں (کسی نہ کسی حد تک) اسٹاف میں بھی لوگ کام پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور باہمی رقابتیں اور رسہ کشی مفقود ہیں۔ ایک وہ بھی ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے!

میں اور کیا لکھوں۔ دل و دماغ حاضر نہیں رہتے۔ ایک طرف ذاتی محاذ پر یہ حال ہے اور دوسری طرف ملکی محاذ کی طرف سے پریشانی۔ کون کہتا ہے کہ عشق خود ایک سیل ہے۔ سیل کو لیتا ہے تھام؟ سب گھر والوں کو سلام اور دعا۔

آپ کا

سید ین

کتاب کی طباعت کا کیا ہو رہا ہے، ممکن ہو تو ایشیا پبلشنگ ہاؤس سے تقاضہ کیجیے اور مجھے باخبر۔ ہو سکے تو خط ضرور لکھیے۔

(۹)

۴رمئی ۱۹۶۳ء   دہلی

رشید صاحب، تسلیم!

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ میں چار روز ہوئے بمبئی سے واپس ہو آیا۔ ایشیا پبلشنگ ہاؤس بھی گیا تھا انہوں نے بتایا کہ کتنی کتابیں تیاری کی مختلف منزلوں میں ہیں اور جلد مکمل ہو جائیں گی۔ میری کتاب کے جس قدر پروف باقی تھے وہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ ایشیا والوں کو بڑی فکر یہ ہے کہ انہوں نے جو لاکھوں روپے ان کتابوں کی اشاعت میں لگائے ہیں ان کا نکاس کیوں کر ہوگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ U.G.C کی طرف سے ان کتابوں کے بارے میں یونیورسٹیوں کو توجہ دلائی جائے۔ میں نے چاہا تھا کہ ڈاکٹر سین سے بات کر کے یہ مشورہ دوں لیکن وہ دہلی سے باہر تھے اور کل یا پرسوں چلے جائیں گے، دو ماہ کے لیے۔ لہٰذا ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اس لیے واپسی پر آپ اس بارے میں یونی ورسٹی کی طرف سے ضرور تحریک کیجیے۔

احمر عباس کو آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا، انہوں نے کہا کہ وہ تعمیل کو حاضر ہیں لیکن بسواس دہلی میں ہیں اور مسودہ ان کے پاس ہے۔ مسودہ ان کے پاس پہنچ جائے تو وہ کام کر دیں گے۔

خدا کرے آپ اور بیگم صاحبہ اور دوسرے عزیز بخیریت ہوں۔ احباب کو میرا سلام۔

آپ کا

سید تین

◈◈◈

ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب

(۱)

۲۰ رفروری ۱۹۶۱ء   جامعہ نگر، نئی دہلی

مجی رشید صاحب، سلامِ شوق!

مجھے آپ سے یوں ہی بہت شرمندگی تھی، تقاضے کے خطوط سے بڑھتی گئی اور جواب دینے کی ہمت کم ہوتی گئی مگر پرسوں تار نے اس طرح جھنجھوڑا کہ یہ چند سطریں لکھنی ہی پڑیں۔

جنوری کے شروع سے شدید سردی، متعدد سفر اور گھر میں بہن اور بلقیس کی علالتیں کام میں رکاوٹ ڈالتی رہیں۔ جو کچھ وقت ملا وہ ہنگامی کاموں کی نذر ہوتا رہا۔ اب ایسے ہی ایک بیگار میں پکڑا ہوا ہوں۔ اس سے فارغ ہوتے ہی سب سے پہلے ہندوستانی تہذیب[۱] کو مکمل کروں گا۔ اُمید ہے شروع مارچ میں ضرور دے دوں گا۔ ۲۴ رکی شام کو علی گڑھ پہنچ رہا ہوں۔ ۲۵ رکو آپ سے ملوں گا اور مزید عذر معذرت کروں گا۔ بدخطی معاف[۲]۔

آپ کا

عابد

---

۱ "Indian Culture" جو شائع ہو چکی ہے۔

۲ عابد صاحب کے ہاتھ میں رعشہ تھا جس کی وجہ سے ان کی تحریر سے بدخطی کا احساس ہوتا تھا لیکن خط واضح تھا اور پڑھا جا سکتا تھا۔ (مرتبین)

(۲)

۱۰ر اگست ۱۹۶۱ء جامعہ نگر، نئی دہلی

مجی رشید صاحب، سلام شوق!

ایشیا پبلشنگ ہاؤس کے سیمی اسرائیل[۱] صاحب کا خط آیا ہے کہ وہ ۱۸ر اگست کو آپ سے ملنے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں بھی اس موقع پر موجود ہوں۔ اگر آپ کی بھی یہی مرضی ہو تو میں آ جاؤں۔

سب عزیزوں کو اور دوستوں کو سلام۔

آپ کا
عابد حسین

۱۔ ان کا نام سیموئل اسرائیل تھا۔

(۳)

۲۰ر فروری ۱۹۶۱ء جامعہ نگر، نئی دہلی

مجی رشید صاحب، السلام علیکم!

عید کی مبارک باد قبول ہو۔ میں نے آپ کی طرف سے مجیب صاحب سے درخواست کی کہ What is Literature? کے عنوان سے ایک کتاب ریڈنگ میٹیریل پروجیکٹ کے لیے لکھ دیں۔ وہ معذرت کرتے ہیں کہ ان کی مصروفیات آئندہ سال ڈیڑھ سال تک انہیں اس کام کے کرنے کا موقع نہیں دیں گی۔

کل اتفاقاً ڈاکٹر ملک راج آنند سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے بہ سبیلِ تذکرہ ان سے کہا انہوں نے اس کام کے کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اب وہ پنجاب یونی ورسٹی چنڈی گڑھ میں آرٹ اور لٹریچر کے پروفیسر ہو گئے ہیں۔ مہینے میں تین ہفتے چنڈی گڑھ اور ایک مہینہ بمبئی رہتے ہیں۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ چونکہ ان کو ایک حد تک معاشی فارغ البالی حاصل ہے اس لیے شاید کتاب کے معاوضے کے معاملے میں زیادہ پاؤں نہ پھیلائیں یوں بھی ان کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجوزہ کتاب میں تاریخِ ادب اور تنقیدِ ادب کے جھگڑوں سے بچ کر صرف چند موٹی موٹی

باتیں Values of Literature? کے بارے میں ہونی چاہئیں اور اس کا حجم سوسوا سو صفحہ کافی ہوگا اس سے اگر آپ ان سے کتاب لکھوائیں تو غالبًا بہت بڑی رقم خرچ نہ کرنی پڑے۔

میرا خیال تو یہی ہے کہ آپ ان سے خط و کتابت کیجیے۔ اُسلوب صاحب کا مسوّدہ انہیں بھیج دیجیے وہ اس میں سے کام کی باتیں لے کر اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھ دیں گے۔

آپ کا

عابد حسین

یہ خط پرسوں شب شنبہ کو دستی موصول ہوا۔

رشید احمد صدیقی

۱۲ر مارچ ۱۹۶۲ء

غلامِ یزدانی صاحب

(۱)

۲۹/اکتوبر ۱۹۶۰ء

باغ خیریت آباد
حیدرآباد، دکن

میرے محترم دوست، سلام اور تحیات!

آپ کا خط نشان 233/G.E.R.M.P(60) مورخہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۶۰ء موصول ہوا۔ آپ میرے نام اور شرکت کار کی کیوں تیخ لگاتے ہیں۔ میرا حال، گھن تولہ گھن ماشہ کے مصداق ہے۔ جیے جاؤں تو اور دس برس جیے جاؤں ورنہ کل کی خبر نہیں۔ میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ محترم ربانی اچھا لکھتے ہیں اور سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اگر مضمون پسند نہ آئے تو مت چھاپیے۔ انگریزی ترجمے کے متعلق بھی آپ دریافت کرتے ہیں۔ میں چند لائق اور ماہر آدمیوں کے نام لکھتا ہوں۔ آپ کا معاوضہ معقول ہے۔ اُمید ہے وہ رضامند ہو جائیں گے۔ آپ کا جی چاہے تو یہ بھی ان کو لکھ دیں کہ میں نے ان کا نام پیش کیا ہے۔

(1) Shri Sivaramamurti.
National Museum of India.
New Delhi.

یہ صاحب اکثر Encyclopaedia میں ہندوستانی آرٹ پر مضمون لکھتے رہتے ہیں۔

(2) Shri K. N. Nilakanta Sastri.
Eliot Edward Road. Mylapure.
Madras.

یہ صاحب پہلے مدراس یونی ورسٹی میں تاریخ اور آرکیولوجی کے اُستاد تھے، اب وظیفہ ہوگیا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی یونی ورسٹی کے تاریخ کے پروفیسروں کے متعلق مزید معلومات آپ کو فراہم کردیں گے۔

(۳) ڈاکٹر سرینواسن (مدراس) اور (۴) شری کرشنا دیو (بھوپالی) کے نام بھی Temple Architecture کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے، لیے جا سکتے ہیں، لیکن Temple Architecture کا تعلق Sculpture سے بہت گہرا ہے اور وہ بہت جذباتی ہے۔ مسلمان بارہویں صدی اور تیرہویں صدی میں یہاں آئے تو مندروں کی دیواروں پر برہنہ تصویروں کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکے اور ان کو مخرب الاخلاق سمجھ کر مسمار کرنا شروع کردیا۔ میں نے پہلے جو دو نام لکھے ہیں، وہ بہت مقبول لوگ ہیں اور ان میں سے کوئی بھی رضامند ہوجائے تو آپ کا کام بن جائے گا۔

مزاجِ گرامی اچھا ہوگا۔

دعا گو

غلام یزدانی

داؤد رہبر صاحب

(۱)

۳۱ر مارچ ۱۹۶۹ء

پرستارِ خندۂ گل قبلہ مدظلکم، آداب!

چلمن کے پاس آپ بیٹھے ہیں، آگے اور پیچھے صحنِ گل ہیں، خوش قسمتی سے بہار کا آغاز ہے، باغ میں پروں والی بلبل کیوں نہ تھی؟ اس کی توجیہہ ہم سے پوچھیے۔ کوئی تو وہاں روز موجود رہتا ہے، پھر وہ پھول کیوں نہ اترائیں؟ کس کی حُسن شناس نگاہ نے ان کو سینچا ہے۔

مجھ کو تھوڑا سا ناز نہیں بہت سا ناز ہے۔ آپ مجھ کو گھر لے گئے آپ کے تکلّم سے جانا کہ گفتگو ایسے نہیں ہوتی جیسے اولے برس پڑے۔ گفتگو عطر کی پھوار کو کہتے ہیں۔

اگر یکدم اس وقت پھر سے ملی گڑھ مجھ کو نصیب نہیں ہے تو کیا سر پھوڑ لوں؟ اتنا ضبط میں نے سیکھ لیا ہے کہ بجائے ایسا کرنے کے آپ کو خط لکھوں اور یہ عرض کروں کہ آپ کا تصور ہے اور مگن رہنے کے سامان ہیں۔ جس دنیا کے مکینوں میں آپ شامل ہیں وہ دنیا بہر حال اچھی ہے اور چنانچہ اس کا خالق بھی شستہ مذاق رکھتا ہے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

داؤد رہبر

(ماخوذ از "سلام و پیام (مکاتیب داؤد رہبر)"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء)

◈◈◈

سیّد محمد احسن صاحب

(۱)

۳۱ر اگست ۱۹۴۲ء
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

جناب رشید صاحب مکرّم، تسلیم!

کیا میں آپ سے دریافت کرسکتا ہوں کہ مسٹر شوکت علی خاں صاحب فانی مرحوم کا کیا خاص تعلق انجمن اُردوئے معلّٰی یا حدیقتہ الشعر سے رہا ہے جس کی بنا پر اُن کی برسی منائی گئی اور مطبوعہ اشتہار کے ذریعہ اعلان کیا گیا۔

کیا مولانا احسن مارہروی صاحب مرحوم کا کوئی خاص تعلق انجمن اردوئے معلّٰی یا حدیقتہ الشعر سے نہیں رہا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر اُن کی برسی کے موقع پر اس قسم کا کوئی جلسہ منعقد نہیں کیا گیا اور اُن کی ادبی خدمات کو نظرانداز کیا گیا۔

براہ نوازش اپنے جواب سے مجھ کو مطلع فرما کر شکرگزاری کا موقع دیجیے۔ فقط

احقر

محمد احسن

(۲)

۱۰ر ستمبر ۱۹۴۲ء
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مکرّمی جناب رشید صاحب، تسلیم!

آپ نے میرے معروضہ مورخہ ۳۱ر اگست کا کوئی جواب ابھی تک مرحمت نہیں فرمایا۔ متوقع ہوں کہ اس کو بھی نظرانداز نہ فرمایئے گا۔

احقر

محمد احسن

نوٹ:

انجمن اردوئے معلیٰ اور انجمن حدیقۃ الشعر مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے زیر اہتمام فانی بدایونی کی برسی کے موقع پر ۲۷/اگست ۱۹۴۲ء کو یونین ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ رشید صاحب اس جلسہ کے صدر تھے۔ آلِ احمد سرور اور مولانا ضیا احمد بدایونی نے فانی کی شاعری پر مقالے پڑھے تھے۔

۳۰/اگست ۱۹۴۲ء کو مولانا احسن مارہروی کی برسی ہوئی۔ ان کی یاد میں کوئی جلسہ نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں احسن مارہروی کے صاحب زادے سید محمد احسن نے ایک خط رشید صاحب کو تحریر کیا تھا۔ اس کا جواب رشید صاحب نے بہت مختصر سا دیا تھا۔

مرتبین

۱۰/ستمبر ۱۹۴۲ء

مکرمی!

اس مسئلہ کو اب جہاں کا تہاں ہی رہنے دیجیے تو بہتر ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

◈◈◈

عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب

(۱)

۱۴ر مارچ ۱۹۶۳ء

ندائے ملت، لکھنؤ
باغ گونگے نواب

معظمی و محترمی، سلام مسنون!

گرامی نامہ صادر ہوا۔ شروع میں آپ نے عذر فرمایا تھا تو پاسِ ادب سے سال بھر خاموشی ہی رکھی، مگر اس دفعہ تو اجازت دیجیے کہ کچھ تو ۔۔۔۔۔ کے ساتھ اصرار کیا جائے۔ یہ لکھنے سے رہ گیا تھا کہ خاکہ کے عنوانات کی پابندی کا خیال نہ فرمائیں۔ اپنے ذوق کی کوئی بھی ایسی چیز مرحمت فرمادیں جو مقصدی طور پر خاکہ سے قریب ہو۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ پاکستان کے ماہنامہ ''چراغِ راہ'' میں محمد علی پر آپ کا مضمون کچھ دن ہوئے دیکھا تھا۔

شخصیتوں کا بھی ایک مضمون رکھا گیا ہے۔ آپ کسی رہنما شخصیت پر مختصر بھی تحریر فرما دیں گے تو ہم لوگوں کو بڑی ہمت افزائی ہوگی۔ سالنامہ تو آپ کی عنایت سے محروم نہ رہے۔ آپ نے کچھ ایسی ''نہیں'' فرمائی کہ دوسرے دن ایک اور صاحب کا جواب آیا اور اب تک وہی آئے ہیں تو وہ بھی نفی میں تھا۔ اس طرح کو بدلنے کے لیے بھی آپ کو ہمدردانہ نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

خادم
عتیق الرحمٰن سنبھلی

---

۱ ''ندائے ملت'' کے سالنامہ کے لیے رشید صاحب سے اصرار کیا گیا تھا کہ وہ کوئی مضمون ارسال فرمادیں۔ رشید صاحب نے معذرت کرلی تھی۔

بشیر حسین زیدی صاحب

(۱)

۷رنومبر

وائس چانسلر
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

مکرمی جناب رشید صاحب، تسلیم!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ میں لنچ میں آپ کے شریک نہ ہونے کو کسی غلط وجہ پر محمول نہ کروں گا۔

یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ظفر احمد[1] صاحب نے Readings from Philosophy پر کام شروع کر دیا ہے۔ وہ قاعدے سے کام کرنے والے آدمی ہیں۔ ذمہ داری لی ہے تو اُسے پورا بھی کریں گے اور ویسے آپ نگرانی تو کرتے ہی رہیں گے۔

مخلص
بشیر حسین زیدی

---

۱ ظفر احمد صدیقی (مرحوم) سابق استاد، شعبۂ فلاسفی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

◈◈◈

خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب

(۱)

۲۷/اپریل ۱۹۵۲ء　　　　　　　　　　ایڈیٹر، مسلم یونی ورسٹی گزٹ

رشید صاحب مکرّم!

گزٹ کے سلسلے میں حالیہ فردِ جرم کے پیشِ نظر میں نے خود اپنے لیے ایک سزا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ مجھے اس ملازمت سے سبکدوش فرمایا جائے۔

یہ اقدام آپ کے لیے بھی مفید ہوگا اور میرے لیے بھی۔ آپ گزٹ کے لیے ایک معقول ایڈیٹر تلاش کرسکیں گے اور میں اپنے لیے ایک بہتر ملازمت۔

میں نے محض آپ کے حکم کی بجا آوری کے طور پر گزٹ کی ایڈیٹری کا بار سنبھالا تھا لیکن ایک سال کے تجربے کے بعد یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اور گزٹ کی ایڈیٹری گول خانے میں چوکھنٹی چیز کے مترادف ہیں۔

میں نے اس یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا ہے اور اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں شعروادب کے حلقوں میں تھوڑا بہت روشناس ہو چکا تھا چنانچہ امتحان کے بعد ہی کئی جگہ سے خطوط آئے کہ میں وہاں جاکر لکچرر شپ کے فرائض انجام دوں، لیکن کچھ تو آپ کا مشورہ اور حکم اور کچھ یونی ورسٹی کی خدمت کا جذبہ جس نے مجھے ڈیڑھ سو روپے ماہوار (جس میں مہنگائی الاؤنس وغیرہ کچھ نہیں) کی ملازمت پر مجبور کیا۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ گزٹ کو اچھے سے اچھا بناؤں چنانچہ میں نے اسے خاص بلیٹن کی حدوں سے نکال کر ایک علمی و ادبی اخبار بنایا اور صرف سرکاری گزٹ کے بجائے اس میں

تھوڑی بہت شئے لطیف کی آمیزش بھی کی۔ اس کا اعتراف علی گڑھ کے اربابِ اقتدار کریں یا نہ کریں لیکن ہندوستان کے مشاہیر علم وادب نے کیا ہے جس کا ثبوت ان کے تبصرے، رائیں اور خطوط ہیں جو مختلف اوقات میں میرے نام آتے رہے ہیں۔

لیکن میں نے جو کچھ کیا شاید وہ آپ لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ مستحسن نہ ٹھہرا، اس لیے اس کے متعلق ہمیشہ کچھ نہ کچھ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، اصل میں گزٹ کا اب تک یہ ڈھرا رہا ہے کہ اس میں صرف رجسٹرار آفس کے کاغذات، نوٹسیں اور ''ضرورت ہے'' کے کالم چھپا کرتے تھے۔ اس کی روایات میں میں نے جو تبدیلی کی وہ برابر کھٹکتی رہی۔ مجھ سے ہمیشہ کہا گیا کہ گزٹ ویسا نہیں نکلتا جیسا ہم چاہتے ہیں لیکن اس ''ویسے'' کی کبھی تفسیر نہ کی گئی اور نہ ہی مجھے کبھی نمونے کے طور پر کوئی پرچہ مرتب کر کے دکھایا گیا کہ میں سمجھ لیتا یہی اس کا معیار ہے۔ ان حدود سے آگے یا پیچھے رہنا ٹھیک نہیں۔

اصل میں گزٹ کے اربابِ اقتدار بھی حق پر ہیں۔ ان کو جس طرح کا گزٹ چاہیے ویسا گزٹ نکالنے کے لیے مجھ جیسے ایڈیٹر کی ضرورت نہیں۔

اسی لیے میری خواہش ہے کہ مجھے گزٹ کی خدمت سے سبکدوش فرمایا جائے اس کام کو معمولی لیاقت کا تھرڈ کلاس بی اے پاس آدمی بھی کر سکتا ہے بلکہ وہی اس کا زیادہ موزوں ایڈیٹر ہوگا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے زمانے میں بھی ہمیشہ ایک ''کلرک نما ایڈیٹر'' رجسٹرار آفس کی نوٹسیں وغیرہ لے کر بے چون و چرا شائع کر دیا کرتا تھا۔ اسی روایتی ''ایڈیٹر'' سے اب بھی یہاں کے لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس کے لیے ڈیڑھ سو روپے بہت کافی ہیں اور وہ اپنے کام سے یونی ورسٹی والوں کو خوش بھی رکھ سکے گا۔ موجودہ صورت میں تو ایک طرف میں بیزار کہ میری تنخواہ میرے لیے ناکافی، دوسری طرف اربابِ یونی ورسٹی نالاں کہ یہ ایڈیٹر گزٹ میں نہ جانے کیا کیا ''خطرناک گولیاں'' رکھ دیا کرتا ہے۔

اُمید ہے کہ میری گزارش شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

نیاز مند
خلیل الرحمن اعظمی

رشید احمد صدّیقی صاحب کا جواب بنام خلیل الرحمٰن اعظمی

۲۹ر اپریل ۱۹۵۲ء

اعظمی صاحب!

یہ تحریر واپس کرتا ہوں جس کا سو آپ کے کہیں اور رہنا میرے نزدیک مناسب نہیں۔ میرے کہنے پر آپ نے جو تحریر بھیجی تھی وہ چونکہ ضابطہ پُری کرتی تھی اس لیے اسے رکھ لیا گیا۔ یونی ورسٹی کیا فیصلہ کرے گی یہ اس کا حق ہے۔ ممکن ہے پرو وائس چانسلر صاحب آپ کو بلا کر اس سلسلے میں خود کچھ کہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا سننا ہوگا آپ اُن سے کہہ سن لیجیے گا۔

آپ کے اور صرف آپ کے نفع کی خاطر خلوص ومحبت کی بنا پر میرے دل میں جو بات آئی تھی وہ میں آپ سے کہہ دیا کرتا تھا۔ میں نے محض کہنے سننے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں تک ہوسکتا تھا آپ کے لیے کچھ کرتا دھرتا بھی رہتا۔ آپ نے ہمیشہ اس کا بڑے خلوص سے اعتراف بھی کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ باوجود خلوص ومحبت کے میری رائے یا میرا نقطۂ نظر غلط ہوسکتا ہے۔ لیکن میرے لیے تو میری اپنی رائے اور اپنا ہی نقطۂ نظر سب کچھ ہیں۔ میں دوسری بات کیسے کہوں جس پر نہ میری عقل گواہی دے نہ میرا ایمان۔ یہ میری عادت ہے کہ میں اپنی بات کہہ کے یا اپنی سی کر کے علیحدہ ہو جاتا ہوں اس پر اصرار نہیں کرتا نہ اس کے پیچھے پڑتا ہوں۔ اپنے نقطۂ نظر کو آپ پر واضح کرنے اور آپ کو اپنے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا مشورہ دینے میں میرا خود کا کیا فائدہ تھا اس پر بھی آپ نے غور کیا؟ میں آپ سے اپنے لیے کسی طرح کا نفع نہیں چاہتا تھا۔ غالباً اس کا آپ کو یقین ہوگا۔ میں تو آپ کی خاطر تھوڑی بہت رسوائی بھی مول لینے پر تیار رہتا تھا۔ ممکن ہے اس حد تک آپ میرا یقین نہ کرتے ہوں۔ آپ تو آپ بہت سی باتوں میں میری بیوی بچے تک میرا کہا نہیں مانتے۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور بے لوث خیر اندیش اور خیر طلبی کا میرے لیے یہ سب سے بڑا انعام ہے۔ خدا اب تک وہ دن نہیں لایا اور شاید اب لائے بھی نہیں جب میں اپنی غرض اور اپنے نفع کے خاطر کسی کو مفید مشورہ دوں۔ بہر حال آپ میری باتوں پر نہ جائیے۔ کیجیے وہی جس کو آپ بہتر سمجھتے ہوں۔ موجودہ معاملہ میں خواہ مخواہ عجلت سے کام نہ لیجیے۔ تھوڑا سا تامّل اور صبر کرنا بھی سیکھیے۔

خیر طلب

رشید احمد صدّیقی

خورشید حیدر صدّیقی خاور امروہوی صاحب

(۱)

۲۲ر فروری ۱۹۷۶ء

وائس پرنسپل، قائد ملت گورنمنٹ کالج
نشتر روڈ، کراچی

مکرّمی و محترمی جناب قبلہ صدّیقی صاحب!

بصد احترام و آداب نیاز مندانہ عرض ہے کہ ۱۹۴۵ء میں ایک مرتبہ شجاع احمد زیبا (جو آپ کے شاگرد ہیں) کی وساطت سے آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا اس کے بعد تا حال حاضرِ خدمت نہ ہو سکا۔

حامل ہٰذا میرے عزیز قریب ہیں ان کے بدست میں اپنی ایک پتلی سی کتاب جو صرف قومی منظومات پر مشتمل ہے بھیج رہا ہوں اور چند اشعار غزل کے علیحدہ سے لکھ رہا ہوں اس درخواست کے ساتھ کہ آپ انہیں ملاحظہ فرما کر اپنے قیمتی خیالات سے نوازیں۔ ممنون ہوں گا اور آپ بھی اپنی ادبی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کریں گے۔ ذیل میں غزل کے اشعار پیش کر رہا ہوں:

وہ لوگ زمانے کے لیے بارِ گراں ہیں
زندہ ہیں جو اس دور میں احساس مٹا کر

تسخیر ثریّا کا کرے عزم تو اے دوست
ہمت تری بن جائے گی خود تیرے لیے پر

ممکن ہو تو کچھ اپنے رویّے کو بدل دو
ہم لوگ بھی انسان ہیں حیوان نہیں ہیں

مجھے بلاتے ہیں خاورؔ کے نام سے احباب
یہ نام آپ نے شاید کہیں سُنا ہوگا

کون کرتا ہے اپنی چیز تلف
آبگینے کو دل کے توڑو مت

کوئی دیکھو تو جا کر کون آیا
یہ کس کے پاؤں کی پائل بجی ہے

قافلہ ہائے رنگ و بو ہیں رواں
ان کو شاید کہیں ہنسی آئی

وہ آئی ہیں گھر پر مرے کیا واقعی خاورؔ
یا خواب بہ الفاظ دگر دیکھ رہا ہوں

ہجوم نوحہ گراں میں خموشی دے حرکت
حنوط مل کے چلے آج تم کہاں کے لیے

جب وہ زلفیں بکھیر دیتی ہیں
وجد میں کائنات ہوتی ہے

طبع نازک گراں بار ہے آپ کی
کیا کہیں. دشمنوں کو نظر ہوگئی

آذرؔ دل نے بنائے ہیں نقوشِ نو بہ نو
اپنے سینے میں دکانِ شیشہ گر رکھتا ہوں میں

زخموں پہ مرے رکھے کہاں تک کوئی مرہم
پھولوں کا گریبان بھلا کس نے سیا ہے

خود کو پہچان کہ چلے کس لیے یہ تیرا وجود
سینۂ گیتی پہ یوں بار نہ بن اے ہم دم

یہ چند اشعار اس لیے تحریر کیے گئے کہ آپ کو میرے رنگِ تغزل کا بھی کچھ اندازہ ہو سکے۔ کراچی کے بعض ادارے میرے اعزاز میں ایک ادبی و تاریخی صبح بنام ''صبح خاور'' منانے والے ہیں اس سلسلے میں ایک ادبی مجلّہ ''یادگار مجلّہ'' کے نام سے شائع ہونے والا ہے اس میں پاکستان کے ڈھائی سو سے زائد دانشور میرے متعلق اپنے خیالات سے نواز چکے ہیں مگر وہ مجلّہ تشنۂ تکمیل رہے گا جب تک کہ بھارت کے دانشوروں کی آراء شامل نہ ہوں۔ خاص طور پر میرے متعلق آپ کے چند الفاظ بھی میری عزت افزائی کے لیے کافی ہوں گے۔

میری یہ کتاب جو پیشِ خدمت ہے صرف قومی منظومات پر مشتمل ہے اس سے قبل ایک اور رزمیہ منظومات پر مشتمل کتاب شائع ہو چکی ہے جس پر صدر پاکستان نے مجھے ''ایوارڈ'' سے نوازا تھا اور بہت سے دانشوروں نے اس کتاب پر تبصرہ کیا تھا لیکن وہ کتاب میرے پاس ایک بھی باقی نہیں رہی اس لیے بھیجنے سے قاصر ہوں۔ اس دوسری کتاب پر حال ہی میں مجھے "Academic Award" سے نوازا گیا ہے۔ میری غزلیات کا پہلا مجموعہ اس ''صبح خاور'' کے موقع پر چھپوا کر مجھے پیش کیا جائے گا۔

مجھے اُمید ہے کہ میری درخواست پر حوصلہ افزائی سے نوازیں گے۔ فقط والسلام

آپ کا اپنا
خورشید خاور

مجنوں گورکھ پوری صاحب

(۱)

۹ر مئی ۱۹۵۸ء

برمکان خان بہادر محمد ذکی صاحب ایڈووکیٹ
''گلستاں'' سول لائن، گورکھ پور

شفیق محترم، سلام علیک!

مجھے افسوس ہے کہ سفر کی عجلت اور گرمی کی شدت کے سبب سے ہمت نہ پڑی کہ علی گڑھ سے چلتے وقت آپ سے پھر ملتا۔ یا آپ نے ''نیازی'' کا جو گراں قدر تحفہ مجھے آدمی کے ہاتھ بھیجا تھا اس کا تحریری شکریہ پیش کرتا، یہاں آکر کچھ مشغول کچھ پریشان رہا اور اَب تک خط لکھنے کی نوبت نہ آئی۔

میں نے فروغِ اُردو لکھنؤ اور کتابستان کو لکھا ہے کہ ''پردیسی کے خطوط'' اور ''نکاتِ مجنوں'' آپ کی خدمت میں روانہ کردیں۔ کتابیں ملنے پر اپنی رائے سے مطلع فرمایئے گا۔

آپ کے رجسٹرار عجب قسم کے آدمی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے میرے ضروری T.A Bill کے سلسلہ میں کم رقم کا چیک دیا تھا جس کی طرف ان کو فوری توجہ دلائی گئی تھی۔ اب تک انہوں نے نہ اس کا کوئی نوٹس لیا ہے اور نہ اپریل کا T.A Bill ادا کیا ہے۔ چند روز ہوئے میں نے ان کو تاکیدی خط لکھا ہے کہ میری دونوں رقوم کا چیک جلد بھیج دیں مگر اَب تک کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ تو کچھ خوش گوار بات نہیں۔ کم سے کم لوگوں کو ان کے زادِ سفر کا بل تو ادا کردینا یونی ورسٹی کا فرض ہے۔ سوا علی گڑھ کے مجھے اب تک کہیں اور ایسی تاخیر کا تجربہ نہیں ہے۔ آپ سے اگر ہوسکے تو رجسٹرار کے دفتر کو اس کا احساس دلا دیجیے۔

اُمید ہے آپ کی صحت قابلِ اطمینان ہوگی۔

آپ کا مخلص نیاز مند

مجنوں

(مشمولہ رشید صاحب کے خطوط، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور)

فضل الرحمٰن صاحب

(۱)

۱۳؍فروری ۱۹۷۱ء

Pro-Vice-Chencellor
Aligarh Muslim University,
Aligarh
D. No. 579 PVC

مجی و مشفقی، تسلیم!

عنایت نامہ مورخہ ۹؍فروری ملا۔ رسمِ خط[۱] سے متعلق آپ کا مضمون فکر و نظر کے لیے مناسب رہے گا۔ ان دنوں پروفیسر مسعود حسین خان صاحب اس رسالے کی ادارت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ مضمون کا مسوّدہ مسعود صاحب[۲] کو بھجوا دیں اور اس بارے میں ان سے گفتگو فرمالیں یا خط کے ذریعہ اشاعت سے متعلق انہیں تحریر فرمادیں۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
فضل الرحمٰن

۱۔ یہ مضمون فکر و نظر کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

۲۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب، رشید صاحب کے شاگرد۔

اطہر صدّیقی صاحب

(۱)

۲۶/اکتوبر۲ے۱۹۷ء

Department of Zoology,
Aligarh Muslim University,
Aligarh, India.

محترمی رشید صاحب، آداب!

میں خود تو اُردو میں مضمون نہ لکھ سکا لیکن میری ایک ساتھی نے اس موضوع پر ایک آرٹیکل لکھا ہے آپ کو اس لیے بھیج رہا ہوں کہ اگر یہ اس قابل ہے کہ فکر ونظر میں شائع ہو سکے تو اس کو فکر ونظر کے مدیر کو بھجوا دیجیے آپ کے نوٹ کے ساتھ جائے گا تو اس کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔

انشاءاللہ مستقبل میں بھی کوشش کروں گا کہ اور مضامین Parasites پر لکھے جا سکیں۔

باقی خیریت۔ والسلام

خادم
اطہر صدّیقی

◈◈◈

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

(۱)

۲/اگست ۱۹۶۰ء

Darul Munannifin Shibli Academy,
Azamgarh, U.P. India

مکرّمی ومحترم، السلام علیکم!

نوازش نامہ ملا۔ ''ہم نفسانِ رفتہ'' میں جو ترمیم ہوسکی ہے وہ کر کے ارسالِ خدمت ہے اب آپ جو حکم دیں اس کی تعمیل بسروچشم ہوگی۔ ہم لوگوں سے جو بَن پڑا ہے وہ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ قیمت میں اور اضافہ کرانا چاہیں تو پھر بآسانی سے بن جائے گا، لیکن یہی قیمت مناسب ہے۔ یہاں اس کتاب کے آرڈر برابر آرہے ہیں۔ اس لیے موجودہ ترمیم پسند ہو تو اَب اس کو شائع کر دیا جائے۔ ٹائٹل وغیرہ نمونہ کے ہیں اس میں آپ جو ترمیم کرنا چاہیں، مطلع فرمائیں۔

''گز بھر سہرا'' کی داد کا شکریہ۔ ابھی میری ایک حقیر تالیف شائع ہوئی ہے اس کی اشاعت کے بعد اس کا دُکھ ہے کہ آئندہ شاید اس سے بہتر کتاب نہ لکھ سکوں گا۔ آپ کے ذوق کی تو نہیں ہے، لیکن جی چاہا کہ آپ کی خدمت میں بھی ایک نسخہ بھیج دوں، اس لیے بھیج رہا ہوں۔ جب کبھی فرصت ملے، اس کے اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیجیے گا۔ آپ کو پھولوں سے بڑا شوق رہا ہے، ایک مضمون ارسالِ خدمت ہے کہ یہ پھول جب کسی مصنف کے ہاتھ آجاتے ہیں تو وہ کس طرح پامال کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب کو آپ کا سلام پہنچا دیا ہے۔ وہ آپ کے خطوط کی اشاعت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ مشاہیر پر تمام اخبارات لکھ رہے ہیں خیال ہوتا ہے کہ ان تمام تحریروں کو ایک کتابچہ کی شکل

میں پیش کر دیا جائے شاید کوئی مزید مفید نتیجہ اور نکلے۔

اُمید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ والسلام

احقر

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن

پروفیسر قمر رئیس صاحب

(۱)

مخدومی و مکرمی، تسلیم!

وکرم یونی ورسٹی کے رجسٹرار ودھانی صاحب سے سُرور صاحب کے اچھے مراسم ہیں جیسا کہ آپ نے اظہارِ خیال کیا تھا سُرور صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ رجسٹرار کے نام میرے لیے ایک ذاتی خط لکھ دیں گے لیکن موصوف کا خیال ہے کہ میرے Thesis[۱] وغیرہ کے سلسلہ میں آپ کا Testimo کہیں زیادہ موثر اور مناسب ہوگا چونکہ آپ نگراں ہیں اس لیے متدعی ہوں کہ اُردو یا انگریزی میں ایک Testimonial مرحمت فرمایئے جس میں اُمید کرتا ہوں کہ میرے مقالہ کی تکمیل، اس کی اہمیت اور نوعیت، میگزین کی ادارت اور پچھلے برسوں میں میری دوسری ادبی سرگرمیوں کا حوالہ بھی دیں گے۔

اس کے علاوہ ایک تکلیف اور دینا چاہتا ہوں۔ سُرور صاحب نے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین یونی ورسٹی کی Committee of Studies (اُردو و فارسی) کے ممبر ہیں۔ اس لیے ایک رقعہ جین صاحب کے نام بھی لکھ دیجیے۔ میں ان سے ایک روز قبل بھوپال میں مل لوں گا۔ آپ کے سہارے اور تعاون کے بغیر میں اپنی کامیابی کا تصور نہیں کرسکتا۔ پرسوں اتوار کو خود حاضر ہو جاؤں گا۔

نیاز مند

قمر رئیس

یہ غالباً ۱۹۵۹ء کا خط ہے۔ (خطوطِ رشید احمد صدیقی مرتبہ پروفیسر آل احمد سُرور)

[۱] قمر رئیس صاحب نے رشید صاحب کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' لکھا تھا۔

سیّد عبدالواحد صاحب

(۱)

۱۰؍جولائی ۱۹۷۰ء

شفیق مکرم!

جہاں تک میں معلومات فراہم کر سکا ہوں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم علی گڑھ چار بار تشریف لے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ چار سفروں میں سے کم از کم تین ایسے تھے جن کے دوران جناب والا علی گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ اگر از راہِ نوازش ان سفروں پر جن کے دوران جنابِ والا علی گڑھ میں حاضر تھے روشنی ڈال سکیں تو بڑا اکرم ہوگا۔

یہ عریضہ منجانب اقبال اکیڈمی ارسالِ خدمت کیا جا رہا ہے۔

نیاز مند

سیّد عبدالواحد

وائس پریسڈنٹ اقبال اکیڈمی

(مشمولہ رشید احمد صدیقی کے خطوط مرتبہ پروفیسر آل احمد سُرور)

ڈاکٹر محمد حسن صاحب

(۱)

۲۴ر جون ۱۹۶۳ء

502, Astoria Hotel,
Churchgate. Bombay.

مخدومی رشید صاحب، آداب و نیاز!

آپ کا ۲۰ر جون کا لکھا ہوا کارڈ آج ملا۔ پتہ نہیں اتنے دن کہاں رہا۔ یہ بھی غالب کا ''مہ نو'' ہوگیا۔ آج راجندر سنگھ بیدی پونا سے آئے ہیں آپ کو یاد کرتے تھے اور سلام کہتے تھے۔ کل اسرائیل[1] کے پاس جاؤں گا تو وہ خط بھی دکھلا دوں گا۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ عباس صاحب نے انیل بسواس والے مسوّدے پر کام کرنے سے صاف انکار کردیا[2]۔ ان دنوں وہ اپنی shooting میں دن رات مصروف ہیں اور یوں بھی انہوں نے کہا کہ Rewriting کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ چنانچہ ''پس چہ باید کرد'' کی منزل ہے۔ ملک راج آنند سے ابھی ملاقات نہیں ہوسکی ہے باہر گئے ہوئے ہیں پرسوں آئیں گے۔

بوس صاحب کے ریویو ظاہر ہے کہ معقول ہی ہوں گے مگر میری ناقص رائے میں اس معاملے کو حاکم بالادست کے پاس بھیجنے کے بجائے زیادہ مناسب ہوتا کہ بوس صاحب جن انتخابات کو مناسب سمجھتے ان کا اضافہ کردیتے جنہیں غیر مناسب سمجھتے انہیں کاٹ کر خارج کردیتے۔ دیباچہ کتاب کی اصل ہے اور وہ تو بہر حال انہوں نے لکھ ہی دیا ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ سیدین صاحب اور بوس صاحب کی باہمی صلاح سے یہ معاملہ طے ہو جائے۔ آگے جیسے آپ کی رائے ہو۔ اگر بقیہ دونوں انتخابات میں Alternations کرتے چلیں تو آسانی ہوگی۔

یہاں موسم خوب ہے کبھی بارش ہوتی ہے کبھی سخت گرمی جس میں تیل کی طرح کا پسینہ نکلتا ہے۔ میرا ارادہ تو ۲۶ رکو روانہ ہونے اور ۲۸ رکی شام تک وہاں پہنچنے کا ہے لیکن بیدی روکنے پر بضد ہیں۔ ممکن ہے دو ایک دن اور ٹھہر جاؤں مگر پہلی تک تو بہر صورت پہنچ ہی جاؤں گا۔

براہِ کرم رؤف کے ذریعہ میرے گھر پر کہلوا دیجیے گا کہ روانہ ہوتے وقت تار دوں گا اسی کے مطابق دہلی پہنچیں اس سے قبل نہیں۔ آپ کو بمبئی سے کچھ منگانا ہو تو لکھ دیں۔

مہر الٰہی صاحب کو سلام کہیے گا۔

فابری صاحب کی کتاب کی تصویروں[۳] کا معاملہ البتہ دوبارہ V.C کو شاید بھیجنا ہوگا کیونکہ ایشیا والے ان کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

نیاز مند

محمد حسن

---

۱ سیموئل اسرائیل، ایشیا پبلشنگ ہاؤس کے اعلیٰ افسران میں سے تھے۔

۲ انیل بسواس کی کتاب کا نام An Introduction to Hindustani Music تھا جو Reviewers نے مسترد کر دی تھی۔ اس کو سہل اُسلوب میں نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

۳ چارلس فابری کی کتاب کا نام An Introduction to European Paintings ہے جو ایشیا پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی تھی۔ رشید صاحب جنرل ایجوکیشن ریڈنگ میٹیریل پروجیکٹ کے ڈائریکٹر تھے اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ پروجیکٹ کی تیار کردہ ساری کتابوں کی اشاعت ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی کو معاہدہ کے تحت کرنا تھی۔

پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج، اورنگ آباد، دکن

۱۵/آذر ۱۳۴۴ف

جنابِ محترم! السلام علیکم۔

رسالین مافیہ اس سال تعطیل دیوالی میں جشن یوم کلیہ منایا جائے گا۔ یہ طے ہے کہ ۵/نومبر ۱۹۳۴ء کو یومِ حالی (مولانا حالی مرحوم کے ولادت کی صد سالہ یادگار میں) منایا جائے گا۔ ان تقاریب میں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کا عظیم الشان اجتماع ہوگا۔ علمی و ادبی تفریح کے سامان بہم پہنچائے جائیں گے۔

حالی جیسے انقلاب آفریں شاعر، مجتہد زبان، صاحبِ درد اور فرشتہ سیرت انسان کے ہم پر گوناگوں احسانات ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم نہایت خلوص دل سے ان سب کا اعتراف کریں۔

ملک کے اہلِ قلم اور صاحبِ ذوق حضرات سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس علمی تحریک میں حصہ لیں۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب، پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ ''حالی'' پر تقریر فرمائیں گے۔

چونکہ جناب کو اُردو ادب سے خاص دلچسپی ہے اس لیے متوقع ہوں کہ اس جلسہ کے لیے کوئی نظم، یا مضمون یا پیغام روانہ فرمائیں تاکہ وہ جلسہ میں پڑھا جائے اور حاضرین اس سے مستفید ہوسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جائز درخواست شرف قبولیت حاصل کرے گی۔ فقط

پرنسپل

قبلہ،

کچھ تو ہونا چاہیے، ڈپارٹمنٹ اور اُردو والے، دونوں کی طرف سے۔ علی گڑھ اور مولانا حالی کے تعلقات پر ایک مختصر ستھرا سا قطعہ کیسا ہوگا؟ حالی ہی کی سلیس اور سادہ زبان میں علی گڑھ کا پیام!

آپ کا

رشید احمد صدیقی

غلام غوث صاحب

۱۰/اکتوبر ۱۹۳۴ء

رشید صاحب، تسلیم!

۸ ستمبر سے اَب تک صرف مولانا سیّد علی احسن صاحب نے دو روز کی C/L، ۱۹ اور ۲۰/اکتوبر کی لی ہے۔ جلیل احمد قدوائی صاحب کی ایک روز کی یعنی ۱۰/اکتوبر کی رخصت کی درخواست آج آئی ہے۔

دعا کا محتاج

غلام غوث

غوث صاحب!

ذرا تکلیف کر کے اگست میں دیکھ لیں کہ ان بزرگوں نے کب کب چھٹی لی ہے۔

آپ کا

رشید احمد صدّیقی

جلیل احمد صاحب نے دو روز کی C/L ۲۷، ۲۸/اگست کو لی ہے۔ مولانا احسن صاحب کو سپیشل رخصت ۱۲/دن کی بلا تنخواہ ۴/ستمبر سے ۱۵/ستمبر تک دی گئی ہے۔

دُعا کا محتاج

غلام غوث

۱۰/اکتوبر ۳۴

۱۹۳۴ء

غوث صاحب مکرّم!

میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بقیہ تاریخ اور یوم بھی لکھ بھیجیں کہ ستمبر سے اَب تک میرے ڈپارٹمنٹ کے کن کن لوگوں نے کتنے اور کس کس قسم کی چھٹیاں لی ہیں تا کہ میں خود بھی رجسٹر میں یادداشت رکھ سکوں۔ شکریہ۔

رشید احمد صدّیقی

بنام رشید احمد صدیقی صاحب

(۱)

۱۰ / اکتوبر　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　سری نگر، کشمیر

مشفقِ مکرّم، تسلیم!

دو قطعہ گرامی نامہ بہت دنوں سے پہنچے ہوئے ہیں اور میں نہایت نادم ہوں کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل نہ کر سکا بلکہ آپ کے دل آویز خطوط کا جواب بھی نہ دے سکا۔ ہاں بطریق جملۂ معترضہ یہ تو فرمایئے کہ جب آپ کے حسنِ طلب کا یہ دل فریب انداز ہے تو دنیا بھر کے اہلِ قلم آپ کی خدمت کے لیے کمربستہ کیوں نظر نہیں آتے۔ میرے اس سکوت کے خواہ کیسے ہی نامعقول وجوہات ہوں یقین ہے کہ آپ سا معقول شخص ان کو قبول کر لے گا۔ لہٰذا عذر و معذرت کی بحث میں وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ آمدم برسرِ مطلب آپ کی خواہش یہ ہے کہ میں کالج میگزین کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ سو میگزین کی تعریف میں یہ کہنا کافی ہے کہ میری میز سے چند گھنٹے کے بعد اُڑا لیا گیا اور اب تک بیسیوں کی سیر کر چکا ہے۔ ہر چند کوشش کی گئی کہ آخری میز کا سراغ لگایا جائے مگر ہرچہ محبوب ست محجوب ست لیکن پتہ نہ چلا، اس لیے ریویو کی کوشش عبث ہے۔

ہاں اس قدر بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں ــــــ من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور میرا بدلگام زبان کچھ اور کہتا چلا جاتا ہے۔ فارسی ادب کی بے سروسامانی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے ــــــ میں بلا خوفِ تردید کچھ کہنا چاہتا تھا اور وہ یہ ہے کہ جب کالج میگزین ایک عرصۂ دراز کے خوابِ ناز کے بعد قطبی خرس کی طرح بیدار ہوا اور اس کا پہلا پرچہ میری نظر سے گزرا تو میرے دماغ کے منجمد پردوں میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس کا کئی سال سے احساس نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں کوئی بہت ٹھوس عالمانہ مضمون نہ تھا مگر اس کے اکثر مضامین کے مطالعہ سے دل و دماغ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی تھی جو بیس برس پہلے کبھی پیدا ہوا کرتی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عام ناظرین کی طبائع پر بھی اس کا وہی اثر

پیدا ہوتا ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر علیگ کی دل میں اس کے مطالعہ سے ایسی ہی گدگدی پیدا ہوئی ہوگی۔ پہلی کشش تو میگزین میں یہ ہے کہ وہ یارانِ نجد کا پیغام ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علی گڑھ ہیومر۔۔۔۔ اس لفظ کا ترجمہ اگر آپ نے وضع کر رکھا ہو تو فٹ نوٹ میں درج کر دیں۔ میرے خیال میں تو اس کا ترجمہ ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ حلوائے۔۔۔۔ امرتسری کے ذائقہ کی تشریح۔ معلوم ہوتا ہے کہ سر سیّد مرحوم نے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

علی گڑھ کالج کے سنگِ بنیاد کے ساتھ ایک مذاقِ خاص کا سیمنٹ ایسا لگا دیا تھا کہ جس کو ابدالآباد تک حوادث کی آندھیاں اور انقلابات کے طوفان کبھی بوسیدہ نہ کر سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ باوجود بہت سے انقلابات، علی گڑھ یونی ورسٹی کے حدود میں اور کالج میگزین کے صفحات میں وہ مذاق خاص موجود ہے۔ جھانپل ایکٹ اور مینڈک کانفرنس وغیرہ مضامین دیکھنے کے بعد مجھے نہایت اشتیاق تھا کہ اس مفرح عنبری کے موجدوں کو ان کے ادبی نشیمنوں میں دیکھوں اور اس اشتیاق نے مجھے علی گڑھ تک پہنچایا، مگر افسوس ہے کہ یونی ورسٹی کے حدود میں تعاون وعدم تعاون اور ذاتیات کی کش مکش دیکھ کر طبیعت افسردہ ہوگئی۔ محمڈن یونی ورسٹی ایک چھوٹی سی سلطنت ہے مگر وہ ابھی نہ شخصی معلوم ہوتی ہے نہ جمہوری۔ توقع ہونی چاہیے تھی کہ مسلمانوں کی اس مایہ ناز یونی ورسٹی میں اہلِ اسلام کی ایک ایسی جماعت ہوگی جن کی آواز اہلِ اسلام کے لیے بانگِ درا کا کام دے۔ مگر افسوس ہے کہ

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

علی گڑھ میں بھی قحط الرجال کی وہی حالت ہے جیسی کہ عام اسلامی دنیا میں اور وہی ذاتی مناقشات قومی قوت کو ضعیف کر رہے ہیں جو ہر جگہ قومی کاموں میں ظہور پذیر ہیں اور میں اس مختصر نوٹ کے ذریعہ سے قوم کو اس امر کی طرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کالج اسٹاف کو بہت زیادہ تقویت دلانے کی اہم ضرورت ہے اور عمائدِ قوم میں سے ایک خاص شخصیت اور اعلیٰ قابلیت کے بزرگ کا مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنا ضروری ہے جو سر سیّد مرحوم کا جانشین ہو اور اس علمی سلطنت کی فرماں روائی کر سکے۔ اسلامی حکومت اور تمدن میں شخصیت کا صدہا سال سے زبردست اثر چلا آیا ہے اور مسلم یونی ورسٹی کے قیام اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ایک نہایت موقر اور محترم

بزرگِ قوم علی گڑھ میں قیام پذیر ہو، جو مقامی جماعت کو پارٹی فیلنگ سے پاک کر کے اس مرکزی دارالعلوم کو متحدہ کوشش سے ترقی دے اور قوم کی توجہ جو آج کل مختلف اغراض میں منتشر ہو رہی ہے۔ تعلیم کی طرف مبذول کرے۔ اگر ٹرسٹی صاحبان متفق ہو کر ایسی شخصیت کی تلاش کریں تو سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایسا خادم اسلام ملنا خارج از امکان نہ ہوگا۔ ٥

احقر

ناظر

از کشمیر

(خوشی محمد ناظر صاحب (بی اے علیگ) گورنر سر، سری نگر، کشمیر، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، جولائی تا اکتوبر ۱۹۲۱ء)

بنام رشید احمد صدیقی صاحب

میگزین کی گزشتہ اشاعت میں سجاد صاحب کا مضمون ''روحِ ادب'' کے عنوان سے ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ ہماری استدعا پر مولانا عبدالماجد صاحب بی اے مصنف فلسفۂ جذبات نے اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار یوں فرمایا ہے:

''۔۔۔۔سجاد صاحب کا مضمون پڑھا، آپ کی فرمائش ہے کہ جواباً کچھ اظہارِ خیال کروں! میرے ان کے تعلقات کا آپ کو علم نہیں ورنہ ایسی فرمائش آپ نہ کرتے، وہ میرے بالواسطہ عزیز ہیں (یعنی عزیزوں کے عزیز) لکھنؤ میں جب پڑھتے تھے تو میرے پاس اکثر آتے رہتے، میں ہمیشہ اُنہیں اپنا خاص عزیز سمجھتا رہا، ان کی ذہانت کی قدر کرتا رہا اور خدا گواہ ہے کہ اب تک ان سے محبت رکھتا ہوں لیکن بدقسمتی سے ان کی نظر ہمیشہ میرے معائب پر رہی۔۔۔۔ان کے اس مضمون کے متعلق مجھے یقین ہے (اور خود انہیں بھی تسلیم ہے) کہ محض میرا داد دینا ان کی جنبشِ قلم کا محرک ہوا ورنہ جوشؔ کے کلام کو دل سے شاید وہ بھی اس قدر پست نہیں خیال کرتے ہیں۔۔۔۔ان کی بارگاہ میں میرا وجود ایسا سخت گناہ ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں ہوسکتا۔۔۔۔ میں ہمیشہ سے ان کے مقابلہ میں سپر افگندہ ہوں، الحمد للہ آج تک کبھی جواب کا قصد نہیں کیا اور اب ''آخری وقت'' میں تو غالباً آپ بھی مجھے زبردستی ''مسلمان'' بنانا پسند نہ فرمائیں۔۔۔۔ سجاد صاحب کے لیے میرا جواباً کچھ لکھنا قطعی لاحاصل ہوگا۔۔۔۔رہا پبلک کے لیے سو عرض یہ ہے کہ جن ''نادانوں'' کے ذہن میں میری تنقید کی کچھ وقعت تھی وہ شاید اس نقدالتنقید کے بعد بھی قائم رہے، باقی جن بزرگوں کا ''مذاقِ لطیف'' اس قسم کے مضامین لکھ سکتا ہے انہیں نہ میری تنقید متاثر کرسکی تھی اور نہ اب اس کا جواب الجواب کرسکتا ہے۔ جوشؔ کے کلام میں اگر میری محدود بصیرت کے مطابق کچھ حقیقی پائیدار خوبیاں ہیں تو انشاءاللہ وہ زندہ رہ جائے گا۔۔۔۔حالی و اقبال اور ان کی ''لطیف المذاق'' سخن سنجیوں کی مثال ابھی بالکل تازہ ہے۔۔۔۔میاں سجاد صاحب کی جو غیر معمولی توجہ میرے حال پر ہے اگر نیک۔ نیتی و خلوص کے ساتھ ہے اور اس سے میری اصلاح

مقصود ہے تو انہیں یقیناً اس کا اجر ملے گا باقی اگر کوئی دوسرا جذبہ اس سعی پیہم کا محرک ہو رہا ہے، تو اس خدائے قادر و توانا کی درگاہ میں جس پر باطن کی گہرائیاں روشن ہیں اور جو بڑی بڑی ترکیبوں سے چھپائے ہوئے رازوں سے واقف ہے بہ صدق دل دعا ہے کہ ان کی اس لغزش کو معاف کرے اور عقل سلیم عطا کرے۔"

ماجد صاحب مجھے معاف فرمائیں، میں موصوف کی آرزو کے خلاف ان کے کرامت نامہ کو شائع کر رہا ہوں، میں اس کی ضرورت سمجھتا تھا، اس لیے نہیں کہ بحث مباحثہ کا ایک ناخوشگوار سلسلہ چھیڑا جائے بلکہ یہ پبلک کا حق ہے کہ وہ صرف ایک ہی فریق کا بیان سننے پر اکتفا نہ کرے، میں نے عمداً ایسے فقرے نقل نہیں کیے ہیں جو محض ذاتی تعلقات پر روشنی ڈالتے تھے اس سے یہ یقین نہیں کرنا چاہیے کہ مجھے اس کی صحت میں کلام تھا یا وہ ضرورت سے زیادہ سخت یا عریاں تھے، میں نے اُن سے اس لیے احتراز کیا کہ وہ محض ذاتی حیثیت رکھتے تھے۔

(رشید)

میگزین کے متعلق صاحب ممدوح نے یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

"------ پرچہ بحیثیت مجموعی اچھا ہوتا ہے، زیادہ ٹھوس پرچہ بحالات موجودہ سنبھل نہیں سکتا۔ میں نے علی گڑھ میگزین اور منتھلی کے کل دور سرسیّد کے زمانہ سے لے کر (جب شبلی اور آرنلڈ اڈیٹر تھے) آج تک کے دیکھے ہیں۔ ایک زمانہ میں یہ خالص علمی میگزین تھا، درمیان میں کچھ بھی نہیں رہا تھا، آپ نے اصلاً تفریحی اور ضمناً علمی حیثیت رکھی، میرے نزدیک بھی یہی روش مناسب ہے۔ اُردو کا حصہ بہتر ہوتا ہے رفتہ رفتہ معیار اور بلند کرتے رہیے۔ انگریزی کا حصہ البتہ ذرا پھیکا ہوتا ہے۔

سب سے بہتر تو آپ کے مضامین ہوتے ہیں۔ ظرافت کے ڈانڈے ابتذال اور چھچھورے پن سے اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ اس کوچہ میں قدم رکھ کر شرافتِ ادب کو قائم رکھنا نہایت دشوار ہے۔ میری نظر سے اُردو کے ظرفا کی صرف دو ہی تین مثالیں گزری ہیں۔ آپ میں بڑی بات یہی پاتا ہوں کہ شوخی کے ساتھ تہذیب، شائستگی، حفظِ مراتب اور خودداری کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اور دوسروں کی خواہ مخواہ دل آزاری نہیں ہوتی۔

نومبر میں آپ کی شخصی تعارف کے بعد آپ کے متعلق اور زیادہ خوش گوار امیدیں قائم ہو گئیں۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

پچھلے نومبر میں حاذق کی ایک نعتیہ غزل کو میں نے بہت پسند کیا مطلع بڑے کیف کا تھا.

بندوں نے کہا لو جی وہ خود ہی خدا نکلے

یہ شعر بھی بہت خوب تھا

کہتے ہوئے عالم بھی لاعلم لنا نکلے

میں ان صاحب سے مطلق واقف نہیں لیکن اندازِ کلام کہتا ہے کہ یا تو وہ خود اہلِ دل ہیں یا کسی اہلِ دل کے صحبت یافتہ ہیں محض تقلیدی شاعر میں یہ بات نہیں پیدا ہو سکتی بہر حال میری داد اُن کی خدمت میں پہنچا دیجیے گا۔۔۔۔"

(ماجد)

(عبدالماجد دریابادی، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، جنوری ۱۹۲۲ء)

رشید احمد صدّیقی۔ شوخ نگار، سنجیدہ گفتار

ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ حسب عادت میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے شرفِ نیاز حاصل کرنے خاتون منزل گیا۔ تانگہ تیار کھڑا تھا اور مولانا کہیں باہر تشریف لیے جا رہے تھے، فرمایا آپ بھی بیٹھ جایئے، میں بیٹھ گیا۔

تانگہ میڈیکل کالج کے دروازہ پر جا کر رُکا، ہم اسپیشل وارڈ میں پہنچے۔ ایک صاحب نہایت آرام سے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ لیٹے لیٹے انہوں نے مولانا کا خیر مقدم کیا۔ یہ رشید احمد صاحب صدّیقی تھے۔ صاحبِ طرز مزاح نگار، علی گڑھ میگزین کے مشہور ایڈیٹر، گردہ کا آپریشن ہوا تھا، اور شاید ایک نکال بھی دیا گیا تھا۔ شروع میں حالت بہت نازک تھی، لیکن اب قابلِ اطمینان حد تک تندرست ہوتے جا رہے تھے۔

رشید صاحب کی شوخ سنجیدگی، یا سنجیدہ شوخی کے اہلِ نظر قائل تھے، شوخی پہلے ہو یا بعد میں، لیکن تھی، ان کے ادب کا ایک غیر منفک جزو، خیال تھا، گفتگو میں بھی شوخی ہوگی، باتوں میں بھی زندہ دلی کے عناصر ہوں گے، لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ تحریر میں شوخی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور گفتگو میں وہ اسے پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ اتنے نستعلیق، سنجیدہ اور سراپا وقار نظر آتے ہیں کہ گمان بھی نہیں ہوسکتا، یہ شوخی سے آشنا ہیں، مولانا نے ایک آدھ بار انہیں اُکسانے کی کوشش کی، لیکن وہ ''چھٹے ہوئے کارتوس'' کی طرح خاموش ہی رہے۔ حیرت ہوئی کہ جو شخص روتے کو ہنسا سکتا ہے وہ خود

صورت بہ بیں حالت مپرس

کا مصداق بنا ہوا ہے، یہ سنجیدگی اور متانت علالت کے سبب نہ تھی تندرستی کے عالم میں بھی میں نے انہیں دو ایک بار دہلی میں دیکھا ہے، جب بھی یہی رنگ غالب تھا، اسے کمال بھی کہہ سکتے ہیں کہ گفتگو کیجیے تو شرمسار اور اشکبار، تحریر دیکھیے تو باغ و بہار اور زعفران زار۔

تھوڑی دیر میں عیادت کے لیے مولانا ظفر الملک صاحب علوی بھی تشریف لے آئے

اور گفتگو ادبِ اُردو پر چھڑ گئی، رشید صاحب نے کہا یونیورسٹی والے بھی عجیب ستم ظریف واقع ہوئے ہیں، سجاد حیدر کو رجسٹرار بنا رکھا ہے، حالانکہ اگر انہیں شعبۂ اُردو کا چیئرمین بنا دیں تو چار چاند لگ جائیں اس شعبہ کو پھر میر محفوظ علی کی ادبیت کا ذکر چھیڑا، کہنے لگے، اُردو کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ میں نے اتنے بڑے ادیب کو جس کا کوئی جواب نہیں ہے، کھو دیا، اس شخص کی تحریر میں جو بات ہے وہ میں نے کسی ادیب میں نہیں دیکھی۔

جامعہ آنے کے بعد رشید صاحب سے ملاقات کا کوئی موقع تو نہیں ملا، لیکن انہیں دیکھنے اور ان کی شوخی سے خالی، سنجیدہ باتوں کے سننے کا کئی بار اتفاق ہوا، ایک بار میں نے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے شکایت کی کہ آخر یہ کیا بات ہے۔ تحریر میں رشید صاحب جتنے شوخ ہیں، گفتگو میں اتنے ہی باوقار اور با تمکین؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے رشید صاحب کی شخصیت پر ایک پُر مغز لیکچر دے ڈالا اور فرمایا ان کی قابلیت ان کی تحریری خوبیاں، ان کی ظرافت، یہ سب چیزیں اپنی جگہ مسلّم ہیں، اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن یہ ان کے اصلی اوصاف نہیں ہیں، ان کا اصلی وصف یہ ہے کہ وہ بہت اچھے، بہت بڑے انسان ہیں، بہ حیثیت انسان ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

رشید صاحب ڈاکٹر صاحب کو "مرشد" کہتے ہیں، لیکن اس وقت مکالمہ بالکل برعکس معلوم ہو رہا تھا۔

(دید و شنید، از رئیس احمد جعفری، رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء)

ہماری روایات

علی گڑھ کی حیثیت محض ایک درس گاہ کی نہیں رہی ہے۔ اس کی نوعیت ایک وسیع خاندان کی بھی ہے۔ ایسا خاندان جو ہر طبقہ اور ہر مزاج کے خورد و کلاں پر مشتمل ہو۔ طلبہ کی اقامت گاہوں کے آس پاس اولڈ بوائز اور دوسرے چھوٹے بڑے ملازمین اور متوسلین کے خاندان بھی دور اور نزدیک پھیلے ہوئے ہیں۔ یونی ورسٹی کے کسی سکونتی مکان میں بیرونی یا غیر متعلق شخص کو ذاتی حیثیت سے رہنے سہنے کی اجازت نہیں۔ شریف نوجوان طلبہ کی موجودگی کا احساس ان خاندانوں کو اور ان خاندانوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[1] رہتا ہے۔ اس طرح شریف گھرانوں کی روایات کا پاس مدت الایام سے ہمہ وقت دونوں کو رہتا آیا ہے۔ اس لیے یہاں کوئی ایسی بات جلد راہ نہیں پا سکتی جو ہماری دیرینہ قیمتی روایات کو مجروح کر سکے۔

علی گڑھ کی روایات کی دھوپ چھاؤں میں مختلف دیار، مختلف طبائع اور طبقات کے جتنے طلبا ایک دوسرے کے کمروں میں، بورڈنگ ہاؤس میں، ڈائننگ ہال میں کھیل کے میدانوں میں، مسجد میں، باغ میں یا بازار میں جماعت اساتذہ کے اراکین سے اولڈ بوائز سے متواتر اور مسلسل ملتے جلتے رہتے ہیں اتنے شاید ہی کہیں اور نظر آئیں اس طور پر ظاہر ہے یہاں کے طلبا میں وہ فرخی، فرزانگی اور فراز بینی آئے گی جو اعلیٰ درجے کی ظرافت اور مزاج کے لیے ضروری ہے۔ علی گڑھ نے اچھے طنز نگار بھی پیدا کیے لیکن وہ جلن کے اتنے پیداوار نہ تھے جتنے جلال کے۔ ان میں اتنی بددلی یا بیزاری نہ تھی جتنی برہمی۔ وہ اتنے بدمزاج یا بدباطن نہ تھے جتنے بے باک اور بے پناہ اچھی اور بڑی طنز کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] الفاظ پڑھے نہ جاسکے۔

-----اچھے سے اچھا کام کرنے میں کس طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔ یہ سعادت مندی بہترین شکرگزاری ہے جو تم اللہ کو پیش کر سکتے ہو جس نے تم کو فراغت اور فراوانی دی ہے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے اور دعا کرتا ہوں کہ تم سب میں یہ صفات ترقی کرتی رہیں اور خاندان کا نشانِ امتیاز بن جائیں۔

اولاد پر والدین اور خاندان کی یہ بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اوّل الذکر کی خوبیوں کی حقیقی امانت دار بنیں اور اپنی اولاد کو ایسی تربیت دیں کہ وہ اس امانت میں اضافہ کر کے آگے بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ جو نعمت دیتا ہے اس کا ٹیکس بڑی خوشی اور پابندی سے ادا کرنا چاہیے۔ اس میں بڑی برکت ہے۔ خدا جس کو جو نعمت دیتا ہے وہ اس کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے دوسروں کو جو اس کے محتاج ہوں پہنچانا بھی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مالی مصارف کے اعتبار سے آئندہ کچھ سال بڑے امتحان اور آزمائش کے گزریں گے اس کا خیال آتا ہے تو بڑے تردّد اور تذبذب میں پڑ جاتا ہوں لیکن اس سے تقویت پہنچتی رہتی ہے کہ اس کو پورا کرنے والا اللہ ہے جس کی رحمت اور قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس لیے اُس پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے۔ وہ ہر بات پر قادر ہے بالخصوص نیک کام کرنے کا انعام دینے پر۔

جس محنت، ایمانداری اور قابلیت سے تم روپے کماتے ہو اُسی فراخ دلی، دل سوزی اور لطف کے ساتھ ضرورت مندوں اور عزیزوں پر صرف کرتے ہو۔ اس کے ہم سب قائل ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ یقین رکھو کہ یہ اللہ کا تم سب پر بڑا کرم ہے کہ وہ اپنے بندوں کی حاجت روائی تم سے کراتا ہے۔

خط طویل ہو گیا ہے۔ اب ذہنی اور جسمانی کوئی محنت بھی برداشت نہیں ہوتی۔ جلد تھک جاتا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بہر حال اب تم سب کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ حافظ و ناصر ہے۔ آمین!

تمہارا

رشید احمد صدیقی

تعارف[1]

شبیہ الحسن رضوی نے اس گلدستہ کو بڑی محنت ومحبت کے ساتھ ترتیب دیا ہے یہ سائنس کے طالب علم ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ اونچے درجے کے سائنس کے طلباء اپنے مضمون کی تیاری میں کتنے منہمک رہتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ شعروشاعری یا سائنس کا ان کے ہاتھوں کیا حشر ہونے والا ہے۔ خود میرا ان کے ہاتھوں جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

رضوی صاحب کی فرمائش تھی کہ میں ان اوراق کا مطالعہ کر کے اپنے خیالات قلم بند کردوں۔ میں بڑی خوشی سے آمادہ ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے خواہ مخواہ لکھتے رہنے میں کوئی لطف آتا ہے بلکہ ایسا نہ کرنے سے اپنے ایک عزیز طالبِ علم کو مایوسی ہوتی وہ بھی ایسے طالبِ علم کو جنہیں اُردو سے کوئی خاص لگاؤ ہونا ضروری نہ تھا، لیکن انہیں اُردو سے محبت ہے۔

اُردو سے مجھے بھی الفت ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اُردو پڑھنا پڑھانا میرا پیشہ ہے یا میں مسلمان ہوں یا اسی طرح کا کوئی اور سبب۔ اُردو چیز ہی ایسی ہے جس سے ہر اچھے ذوق رکھنے والے کو محبت ہونی چاہیے۔ اس میں مَیں نے سب سے اچھی باتیں سنیں، اپنے شوق کی باتیں بڑے فخر بڑے لطف اور بڑے اعتماد سے سنائیں، دل کی گہری سے گہری، بلند سے بلند، نازک سے نازک باتوں کو آواز اور معنی کے اچھے سے اچھے پیرایہ میں پیش کر سکا، لیکن یہاں اپنی محبوب ترین کمزوریوں کو کیوں بے نقاب کروں۔

اُردو کے خلاف آج کل جیسی کارروائیاں ہو رہی ہیں، رضوی صاحب نے ان پر اپنے خیالات کا اظہار بڑے خلوص سے کیا ہے۔ کہیں کہیں وہ جذبات کے تلاطم میں کھوئے بھی گئے ہیں۔ انہیں اپنا کھویا جانا اچھا بھی معلوم ہوتا ہوگا، اس لیے کہ نوجوانوں کو یہ چیز بہت مرغوب ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ان کا لہجہ جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گیا ہے نوجوانوں کو یہ چیزیں زیب بھی دیتی ہیں۔ مناسب ہونے کا سوال دوسرا ہے۔

تاہم اتنا کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں کہ سائنس کا طالب علم جذبات کا بندہ نہیں

ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی جیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بات جچی تلی کہتا ہے۔ نہ عبارت میں حشو وزوائد سے کام لیتا ہے اور نہ جذبات کے بھنور میں غرقاب ہونا اس کے شایانِ شان ہے۔ رضوی صاحب نے اشعار کے سراہنے میں بھی دو ایک جگہ مبالغہ اور عقیدت سے کام لیا ہے۔

اُردو ہندی کا مسئلہ اب علمی ولسانی مسئلہ نہیں رہا، تمدنی بھی نہیں بلکہ قطعاً سیاسی، اور ہندوستان کی فضا آج کل جیسی مکدر و متعفن ہو رہی ہے وہ بھی کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اُردو کوئی بدیسی چیز نہیں ہے، نہ بدیسیوں نے اسے رواج دیا۔ یہ یہیں کی پیداوار ہے اور یہیں کے لوگ اس کا مان دان کرتے آئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوئی۔ لیکن مسلمان اسے نہ تو اپنے ساتھ لائے اور نہ تنہا وہ خود اس کے بنانے بڑھانے اور سنوارنے کے ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان والے انصاف اور بھلمنساہٹ کی نظر سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے آنے سے پہلے ہندوستان متفرق و منتشر تھا۔ متحد ہندوستان اور مشترک زبان کی برکت مسلمانوں ہی کی دی ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر ہندوستانی ہو کر حکومت کی۔ یہ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ زبان اور قومیت کا جو تاج محل وہ کھڑا کر رہے ہیں وہ مسرت و عزت کے ساتھ یاد کیے جانے کے بجائے خود غرضی و تنگ نظری کا طوفان برپا کر دے گا۔ ہم ہندوستانیوں میں عجیب بات یہ ہے کہ ہم اسباب پر غور نہیں کرتے، نتائج پر لڑ مرتے ہیں۔ ایک خاص تمدن، ایک خاص زبان، ایک خاص حکومت روس، جرمنی اور اٹلی میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثریت و اقلیت کی جو نیرنگیاں یورپ میں دیکھنے میں آتی ہیں وہی ہم یہاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ جب تک ہندوستان کے زمین و آسمان ہی منقلب نہ ہو جائیں یہ باتیں یہاں کیونکر میسر آ سکتی ہیں۔ مطلق العنان حکومتوں کی سب سے بڑی قوت، جمہوریت یا محکومیت کے حق میں سب سے بڑا فساد ہے، جس کو کبھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ ایک عرصہ سے میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ میدانِ جنگ کے قوانین امن و صلح کے زمانے میں مضر ہی نہیں مہلک ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ میدانِ جنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک جنگ تو بیرونی دشمنوں سے ہوتی ہے، دوسری آپس میں سر پھٹول اور گالی گلوچ۔ بیرونی دشمنوں سے عہدہ برا ہونے کی تدابیر اور ہیں، آپس کے مناقشات اور طرح سے دُور کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں نہ تو خالص اسلامی حکومت ہو سکتی ہے، نہ خالص ہندو راج یا تو دونوں کے اتفاق سے حکومتِ متحدہ ہوگی یا پھر محکومیت تو کہیں گئی نہیں ہے!

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو کے معاملے میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمان جو چاہیں کریں لیکن اس بات کو فراموش نہ کریں کہ اس زبان کے بنانے سنوارنے میں ہندوؤں کا بھی حصہ ہے۔ اس لیے زبان کو اپنا لینے کے بجائے اس کو ہمہ گیر بنانے کی کوشش کریں۔ ان کو ہمیشہ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اصلی اور سچی زبان وہی ہے جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں اور اپنے لیے مفید پائیں اس لیے ہم کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اور جس طرح ممکن ہو، ہم اُردو کو ایسی چیز بنا دیں کہ ہر شخص اس سے فائدہ اور لطف اُٹھائے۔

رضوی صاحب نے مشاعرہ اور تقریب کے حالات بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس محفل کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے حالات و واقعات کا قلم بند اور شائع ہونا ضروری ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے اُردو کو تقویت پہنچے گی اور ہمارے تمدن کا ایک پہلو نمایاں طور پر آئندہ نسلوں کے سامنے آتا رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیالات بڑے مستحسن ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو کام رضوی صاحب کر رہے ہیں اس سے اتنا نفع نہ پہنچے گا جتنا کہ اس تقریب کے سلسلہ میں معمولی سے معمولی کوئی یادگار قائم کر دینے سے ہو سکتا تھا۔ مشاعرے ہماری سوسائٹی میں بہت مقبول ہیں، اتنے مقبول کہ ہم اپنے بڑے سے بڑے فرائض کو بھی مشاعرہ ہی سمجھنے لگے ہیں۔ ہر جگہ واہ واہ، ہوحق، چہل پہل، شور و شغب اور کبھی کبھی مار پیٹ، اس کے بعد پھر کچھ نہیں! غور کیجیے تو آپ مسلمانوں کے ہر کام میں یہی باتیں پائیں گے اور یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ مشاعرہ ہر جگہ کامیاب رہتا ہے، قوم ہر جگہ رسوا ہوتی ہے۔ اس کی بھی کچھ فکر کرتے رہیے۔

(شائع شدہ ''شمیم سخن''۔ یہ کتاب ۱۰ر جنوری ۱۹۳۹ء کو، قصبہ بلور (ضلع بستی) اتر پردیش میں ایک صاحب کی شادی کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرے کا گل دستہ ہے جسے سیّد شبیہ الحسن رضوی بلوری نے مرتب کیا تھا جو اُس زمانے میں مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں بی ایس سی کے طالب علم تھے اور اُردو زبان و ادب سے خصوصی شغف کی بنا پر رشید احمد صدیقی صاحب سے بہت قریب تھے۔ اُن کی فرمائش پر رشید صاحب نے ان کی مرتب کردہ اس کتاب کا تعارف لکھا تھا)

مولانا آزاد لائبریری کا گوشۂ رشید

علی گڑھ کے نامور فرزند، مشہور ادیب اور صاحبِ طرز مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک طویل عرصہ تک مسلم یونی ورسٹی میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں اور فقید المثال شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کو علی گڑھ سے قلبی لگاؤ اور والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے آخر وقت تک علی گڑھ کی ایک سچے عاشق کی مانند، مدح سرائی کی۔ علی گڑھ سے ان کے اس غیر معمولی تعلق کی بناء پر ضرورت اس بات کی تھی کہ یہاں ان کی ایک یادگار قائم کی جائے تاکہ رشید صاحب کے حوالے سے لوگ علی گڑھ کو اور علی گڑھ کے حوالے سے رشید صاحب کو یاد رکھ سکیں۔

یہ بات بڑی مسرت انگیز ہے کہ مولانا آزاد کے اربابِ حل و عقد نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور لائبریری کے اُردو سیکشن کے تحت ایک ''گوشۂ رشید'' قائم کیا جس کی ترقی روز افزوں ہے۔ رشید صاحب کو علم سے جو غیر معمولی شغف تھا، اس کے پیشِ نظر، ان کی یادگار کے لیے لائبریری سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس گوشہ کے قیام کے سلسلہ میں ضلع علی گڑھ ہی کے ایک فرزند اور رشید صاحب کے نادیدہ عاشق جناب لطیف الزّماں خاں (مقیم حال ملتان، پاکستان) کا بھی بڑا اہم کردار رہا ہے۔ دراصل یہ ان ہی کی کوششوں سے قائم ہوا اور یہ ہی اس کے لیے کتابیں بھیج رہے ہیں۔ اب تک اس میں دو ہزار کے قریب کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔ ان میں چند رشید صاحب کی تصانیف ہیں، کچھ رشید صاحب سے متعلق بھی ہیں، ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر اہم کتابیں بھی شامل ہیں۔ رشید صاحب کی محبوب شخصیتیں سر سیّد، غالب، اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین تھیں۔ اس گوشہ میں سر سیّد، غالب اور اقبال سے متعلق تمام اہم پاکستانی تصانیف شامل کی جا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، سائنسی علوم، ادبیات، انتقادیات، لغات، علم الّسنہ، شعری مجموعے، سفرنامے، سوانح وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر پاکستان کی معیاری تصانیف بھی اس گوشہ کی عظمت و وقعت میں اضافہ کر رہی ہے۔ ان میں انجمن ترقی اُردو پاکستان، مقتدرہ قومی

زبان، مجلس ترقی ادب لاہور، اقبال اکادمی، اُردو سائنس بورڈ جیسے وقیع اداروں کی مطبوعات شامل ہیں۔ توقع ہے کہ جناب لطیف الزّماں صاحب کی خصوصی توجہ سے جلد ہی یہ گوشہ لائبریری کا ضخیم ترین ذخیرہ بن جائے گا۔

پروفیسر نورالحسن
یونیورسٹی لائبریرین

(شائع شدہ: علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نیوز اینڈ ویوز (رشید نمبر)، اکتوبر ۱۹۹۵ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تصانیف جو شائع ہو چکی ہیں

مرتبہ لطیف الزّماں خاں/م۔ندیم شمسی (علیگ)

۱۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد اوّل
۲۔ عزیزان علی گڑھ
۳۔ خطباتِ رشید احمد صدیقی
۴۔ گنج ہائے گراں مایہ حصہ دوم
۵۔ سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں
۶۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد دوم
۷۔ مرشد، ذاکر صاحب ہمارے ذاکر صاحب
۸۔ غالب نکتہ داں
۹۔ پیام اقبال
۱۰۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد اوّل دوسرا ایڈیشن
۱۱۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد سوم
۱۲۔ میزانِ نثر جلد اوّل
۱۳۔ میزانِ نثر جلد دوم
۱۴۔ میزانِ نثر جلد سوم
۱۵۔ میزانِ نثر جلد چہارم
۱۶۔ میزانِ نثر جلد پنجم
۱۷۔ عزیزانِ علی گڑھ بخط رشید احمد صدیقی
۱۸۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد چہارم
۱۹۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد اوّل تیسرا ایڈیشن
۲۰۔ تبصرے، تصارف اور مقدماتِ رشید احمد صدیقی
۲۱۔ خطوطِ رشید احمد صدیقی جلد ششم